پانی پت اور

بزرگانِ پانی پت

مسجد درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندر
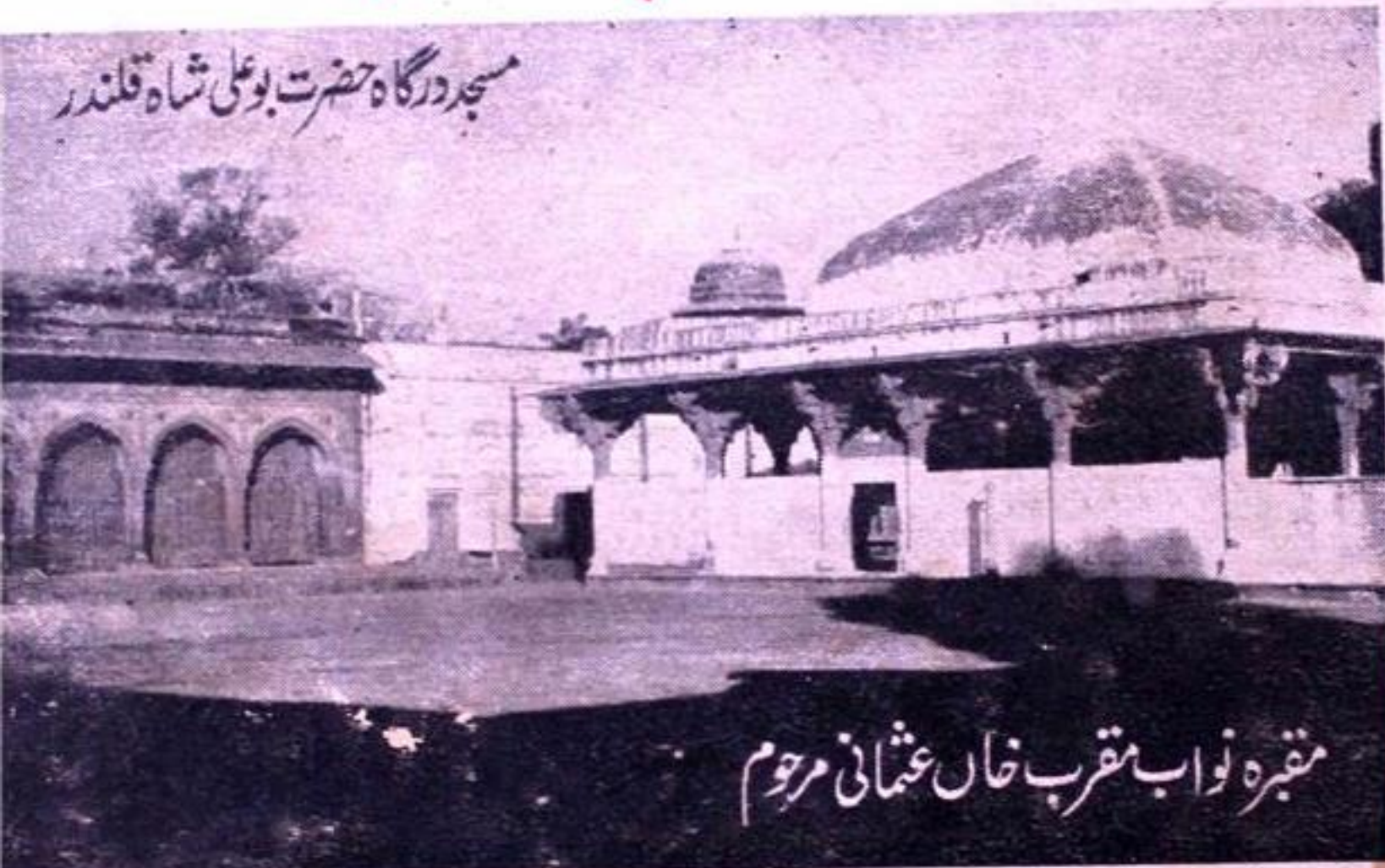
مقبرہ نواب مقرب خاں عثمانی مرحوم

درگاہ حضرت بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ
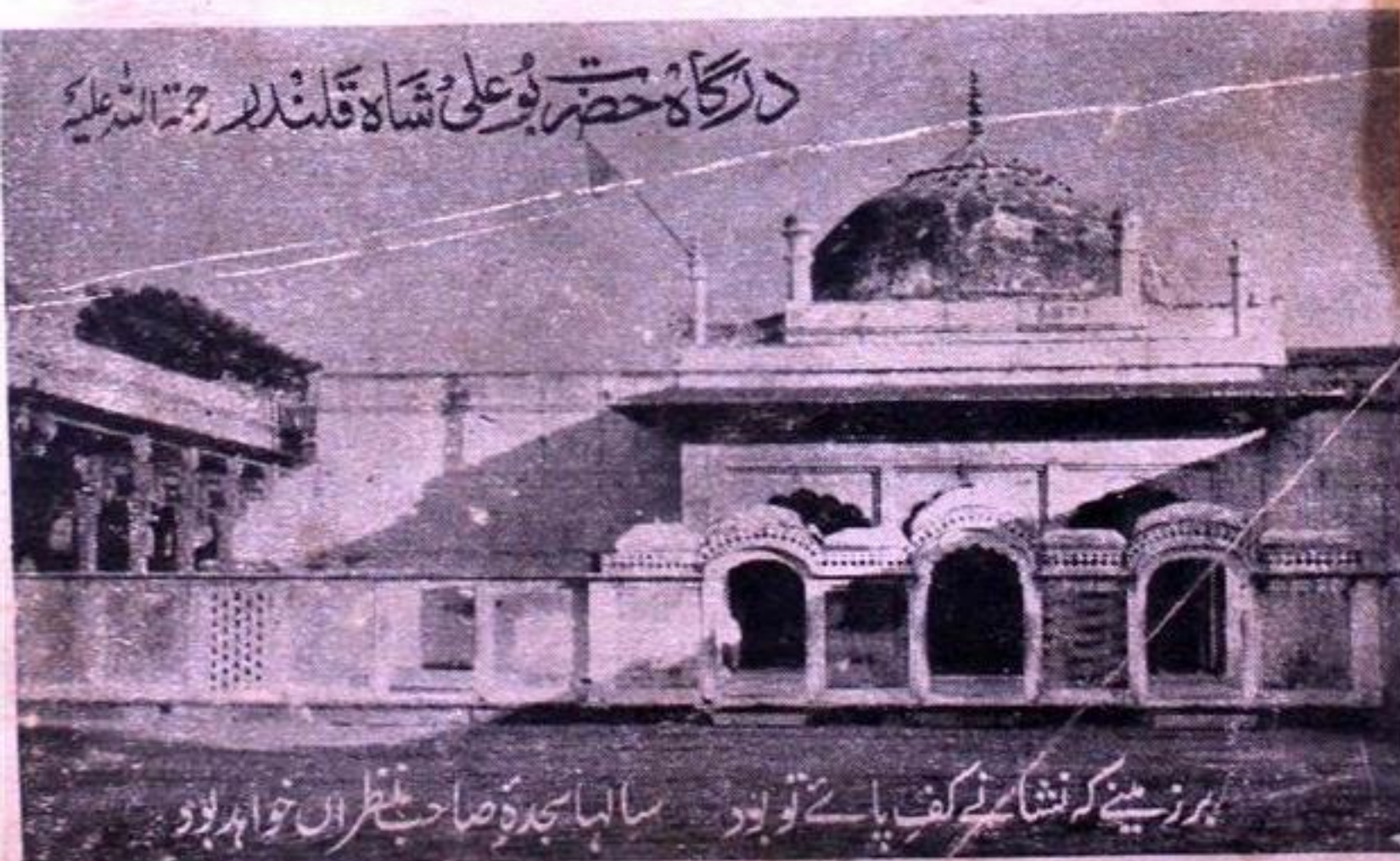
بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

هو الحق

پانی پت

اور

بزرگانِ پانی پت

سیدنا

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ

حضرت خواجہ شمس الدین ترک۔ مخدوم المشائخ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء
شیخ اعلیٰ چشتی پانی پتی وغیرہم۔ رحمہم اللہ

از

مولانا سید محمد میاں صاحب۔ ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند
مصنف۔ علماء ہند کا شاندار ماضی، علماء حق، تاریخ اسلام، اسلامی فکر وغیرہ

حسب فرمائش
حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی۔ پانی پتی

مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی ۶ ——— قیمت ؎۲
ملنے کا پتہ:۔ (۱) حضرت مولانا لقاء اللہ عثمانی، پانی پت ضلع کرنال (پنجاب)
(۲) کتابستان۔ گلی قاسم جان۔ دہلی ۔ ۶

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ

پانی پت اور بزرگانِ پانی پت

عام عقیدت کے اسباب

پانی پت ہندوستان کا مشہور شہر ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور سپہ سالار اور فاتح راجہ "ارجن" نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

دہلی یہاں سے جنوب کی جانب ۵۳ میل کے فاصلہ پر ہے اور جانب شمال میں تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر برادرانِ وطن کا مشہور "تیرتھ" کورکشیتر ہے۔ جس کا دوسرا نام "تھان الیشور" تھا۔ جو بعد میں "تھانیسر" ہوگیا۔

ہندوستان کی تاریخ قدیم میں اگر "کورکشیتر" اس لئے شہرت رکھتا ہے کہ یہاں ایک خونریز معرکہ نے "حق وناحق" کا فیصلہ کیا تھا، تو بعد کی تاریخ میں پانی پت اس لئے مشہور ہے کہ یہ بہت سی فیصلہ کن لڑائیوں کا میدانِ جنگ بنا۔ جہاں متعدد بار حکمراں خاندانوں یا جنگجو قوموں کی قسمت کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی قیامت خیز اور خونریز لڑائیوں کے بعد پورے ملک میں بار بار علم انقلاب بلند ہوا۔

انقلاب ۱۹۴۷ء دنیا کی چشم حیرت نگار نے ۱۹۴۷ء جیسا کوئی انقلاب

نہیں دیکھا ہوگا۔ کہ نہ دو بادشاہتوں میں تصادم ہوا۔ نہ حاکم اور محکوم کے آپس میں خونریزی ہوئی۔ حکمراں محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب و بنگال کے عوام تباہ و برباد۔ اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل دیا۔ تقریباً ۵۰ ہزار کی مسلم اکثریت شہر بدر، مسجدیں ویران، مدرسے برباد، مقابر و مزارات تباہ، جس شہر میں ہزاروں حافظ قرآن اور نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حافظ قرآن، اس شہر میں صرف ایک کلمہ گو باقی رہ گیا۔ جس کی قوت ایمانی نے اس کے قدم استقلال کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بنا دیا۔ یہ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا نفس نفیس تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریباً دو سال بعد اسی ایک جڑ سے شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے آبیاری کا فرض انجام دیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کو بہترین استاذ قاری محمد عمر عطا فرما دیا۔ ابتداً جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے کچھ امداد دی گئی۔ پھر وقف نواب عظمت علی خاں صاحب (آف کرنال) سے امداد مقرر ہوئی۔ اس طرح ایک تعلیمی مرکز قائم ہوا۔ پھر خدا کے فضل سے کچھ اور مسلمان بھی مختلف پیشوں کے سلسلہ میں یہاں آنے لگے۔ اب مسلمانوں کی تعداد چند سو تک پہونچ چکی ہے لیکن ایک مسجد کے علاوہ باقی تمام مساجد ویران پڑی ہیں یا دوسروں کے قبضہ میں ہیں۔ اسی طرح مقدس مزارات کے گنبد اور حجرے رہائشی مکان بنے ہوئے ہیں۔ کافی جد و جہد کے بعد حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ کی درگاہ خالی کرائی گئی ہے۔

وجہ تالیف

ان حالات کی بنا پر حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا اصرار ہوا کہ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت کے حالات یکجا شائع کر دیئے جائیں تاکہ چشم عبرت کے لئے ذخیرہ رہیں۔

اگرچہ علمی بے مائیگی کے ساتھ وقت کی قلت بلکہ وقت کا صحیح معنیٰ میں قحط احقر کے لئے معقول عذر تھا۔ لیکن حضرت مولانا کے ارشاد گرامی اور حضرات اکابر اولیاء اللہ

رحمہم اللہ سے فطری انس نے مجبور کیا کہ تعمیل کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا نہایت انتشار اور پراگندگی میں اس گلدستہ کی شیرازہ بندی کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق بخشے اور خود اپنی جناب میں اور اپنی مخلوق کی نظر میں اس کو مقبول بنائے (آمین)

تاریخ پانی پت کا ایک نظر انداز پہلو

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "پانی پت" کی شہرت انھیں سیاسی لڑائیوں کی وجہ سے ہے۔ مگر افسوس اس اقتدار پرست سیاسی تاریخ کے دہشت خیز اور نفرت انگیز ہنگاموں میں تاریخ پانی پت کا وہ پہلو قطعاً نظر انداز ہوتا رہا جس کا تعلق اخلاق، روحانیت اور سماجی زندگی سے تھا۔ اور کسی ایک سیاسی یا مذہبی فرقہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ انسانی شرافت وعظمت اور خود ہندوستان کے مذہب پرست مزاج کے لحاظ سے اس کا بیان کرنا بہت ضروری تھا۔

چودھواں سال چل رہا ہے کہ پانی پت ۱۹۴۷ء کے اس طوفان سے گذرا تھا جس نے "انقلاب" کے نام پر بھائی کو بھائی سے جدا کیا۔ یہاں تک کہ وطن عزیز کے جسم پاک کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یکہ و تنہا صرف ایک مولانا لقاء اللہ صاحب کے علاوہ پوری مسلم آبادی یہاں سے اجڑی۔ اور مادر وطن نے وطنیت کے جس دھاگے سے ہندو اور مسلمانوں کو باندھ رکھا تھا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کیونکہ ہندو مسلم منافرت کے وہ بیج جو انگریزی دور حکومت میں تقریباً ایک صدی پہلے بوئے گئے تھے اس وقت ان کے کڑوے پھل پوری طرح پک چکے تھے۔

لیکن کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ عقیدت کے وہ رشتے جو بزرگان پانی پت سے ہندو اور مسلمانوں کے مشترک طور پر صدہا سال سے جڑے چلے آرہے تھے ان کی ایک گرہ بھی نہیں ٹوٹی۔

ایک دلچسپ معمہ

مسلمانوں کی حکومت عرصہ ہوا ختم ہو چکی، ان کا اقتدار

مرٹ چکا، ۱۹۴۷ء نے ان کے اس پلّہ کو بھی بے وزن کر دیا جو مردم شماری کے لحاظ سے پانی پت میں بھاری تھا لیکن بزرگانِ پانی پت سے عقیدت و محبت کے وہ چراغ جو برادرانِ وطن کے دلوں میں شروع سے روشن ہیں۔ آج بھی ان کی لو اسی طرح بھبک رہی ہے۔ اور عقیدت کے پھول جس طرح پہلے چڑھائے جاتے تھے آج بھی اُن کے ہار اسی طرح پہنائے جا رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب معمہ ہے جو اگر آج تک حل نہیں ہوا تھا تو جمہوریت کے اس دور میں جس کی بنیاد میل ملاپ، انسانی بھائی چارے، ہمدردی، غمخواری اور مساوات پر رکھی جا رہی ہے ضرور حل ہونا چاہیئے۔

معمّہ کا حل حقیقت یہ ہے کہ فوجی اقتدار اور شوکت و حشمت کے سامنے مغلوب انسانوں کی گردنیں ضرور جھک جاتی ہیں، مگر دل کبھی نہیں جھکتے۔ انسانوں کے دل صرف اسی کے سامنے جھکتے ہیں جو خود اپنے خالق اور معبود کے سامنے جھکا ہوا ہو جس کے دل میں انسانوں سے ہمدردی ہو۔ جو ساری مخلوق کو خالق کا کنبہ اور اس کی عیال سمجھتا ہو۔ جس نے خلق خدا کی محبت کی وادی سے اپنے خالق اور معبود تک پہونچنے کا راستہ نکالا ہو۔ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ کی خصلتیں اختیار کرو) جس کا عملی پہلو یہ ہے کہ جس طرح اللہ رب العالمین، ارحم الرحمین ہے۔ وہ بھی اسی طرح مخلوق خدا کے لئے سراسر رحم اور پیکر شفقت بنا رہے۔ اس کی آغوش شفقت ہر مصیبت زدہ کے لئے کھلی ہوئی ہو۔ اور اس کا کاشانہ رحم ہر ستائے ہوئے کی پناہ گاہ ہو۔ جہاں نہ رنگ و نسل کا کوئی فرق ہو اور نہ مذہب و ملت کا کوئی امتیاز ہو۔

ایک مثال ابھی پندرہویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یورپ کے سفید فام، ہندوستان آنے لگے۔ ان کے تاجر آئے، ان

کے مبلغ آئے، روحانی پیشوا آئے، پھر ان کے حکمراں آئے، ان کی حکومت قائم ہوئی. اور ان کے اقتدار کا جھنڈا ایسا بلند ہوا کہ اس کے سامنے مسلمانوں کی شوکت وحشمت کے افسانے بھی فراموش ہو گئے۔ عیسائی مشنریوں نے انتھک کوشش اور بے شمار روپیہ خرچ کرکے اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کی۔ جگہ جگہ مشن اسکول، کالج اور ہسپتال بنوا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کیا۔ اور اس پانسو سالہ دور (۱۴۸۵ء تا ۱۹۴۷ء) میں چند لاکھ پسماندہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنا بھی لیا لیکن باہمی تعلقات کے اس طویل دور میں عیسائیوں کا کوئی ایک روحانی پیشوا بھی ایسا نہیں گزرا جس کی پاک زندگی اور روحانی عظمت نے ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو جھکایا ہو۔ جس کی زندگی میں سب نے مل کر اس کے "چرن" چھوئے ہوں اور مرنے کے بعد کسی بھی ہندو یا مسلمان نے اس کی تربت پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہوں۔ اس کے برعکس پورے ہندوستان کے سینکڑوں مزارات اور درگاہوں کو چھوڑ کر صرف "پانی پت" کو لیجئے کہ یہاں بہت سے بزرگوں کی درگاہیں آج بھی ایسی ہیں جن کی طرف "خلق خدا" امنڈا امنڈ کر آتی ہے۔ اور مسلمانوں سے زیادہ نہ سہی تو کم از کم مسلمانوں کے برابر اور ۱۹۴۷ء کے بعد جہاں مسلمان نہیں رہے وہاں صرف ہندو ہی ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان پر چادریں چڑھاتے ہیں، چراغ جلاتے ہیں منتیں مانتے ہیں۔ اور جب خدا کے فضل سے منتیں پوری ہو جاتی ہیں تو چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نذریں گذارتے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے۔؟ یہ عقیدت کا ترکہ پشتہا پشت سے ان کو کیوں ملا؟ کس طرح ملا؟

اب آیئے واقعات کی دنیا کا رُخ کیجئے۔ محض خیالی باتوں اور بناوٹی کہانیوں سے نہیں۔ بلکہ تاریخ کی سچی حقیقتوں سے اس عقیدت اور محبت کی وجہ معلوم کیجئے۔

تاریخی حقیقت

مسلمان ناراض نہ ہوں آج ہمیں صاف اور سچی بات کہنی ہے۔ جب مسلمانوں نے دہلی فتح کیا۔ تو ملوکیت اور شہنشاہیت

کی وہ ساری آن بان اختیار کر چکے تھے جس سے اسلام نے نفرت کی تھی۔

ملوکیت اور بادشاہت درحقیقت بہت بڑی خود غرضی ہے اور خود غرضی بھی زہریلی قسم کی جس میں بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ بیٹا باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ ضرورت پڑے تو باپ بیٹے کا سر قلم کراتا ہے اور ماں بیٹے کے حق میں ناگن بن جاتی ہے۔

انھیں بادشاہوں کا مقولہ بلکہ عقیدہ تھا کہ "الملک عقیم" یعنی بادشاہت کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔"

یہ خود پرست بادشاہ صرف بادشاہت ہی کو سب سے بڑا رشتہ اور ناتہ سمجھتے ہیں۔ جو ان کی بادشاہت کی حفاظت کرے۔ وہ اگر غیر بھی ہے تو عزیز رشتہ دار، اور جو اس سے کچھ بھی بیر رکھے، کچھ بھی اختلاف کرے۔ وہ اگر ماں جایا بھائی یا خود اپنے جگر کا ٹکڑا بھی ہے تو خونی دشمن۔

بارھویں صدی عیسوی کے آخیر میں یعنی ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں نے دہلی پر قبضہ کیا۔ جب رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۶۳۲ء) پر ساڑھے پانچ صدی سے زیادہ مدت گذر چکی تھی، اور اتفاق سے یہ فتح کرنے والے بھی عرب نہیں تھے۔ بلکہ عربوں کے بعد دوسری قوموں کے اور دوسرے ملکوں کے جنگجو اور لڑاکو سپاہی تھے جو عربوں کے اقتدار کو بھی ختم کر چکے تھے۔

بیشک انھوں نے ہندوستان میں بہت سی بلند بلند عمارتیں بنوائیں۔ بہت سی مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مزارات کے بڑے بڑے قبے اور گنبد بنوائے، رعایا کے فائدے کے بھی بہت سے کام کئے۔ ملک کی صنعت۔ تجارت اور زراعت کو ترقی دی۔ ہندو مسلمانوں کی تفریق مٹائی، مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی فوجوں میں بھرتی کیا۔ ان کو اونچے اونچے عہدے اور منصب بھی دیئے۔ ان کے

مندروں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر ان سب کی تہ میں جو جذبہ سب سے زیادہ کارفرما تھا وہ بادشاہت کا جذبہ تھا اور یہ جذبہ ایسا تھا کہ جب ابھرتا تھا تو جس طرح کبھی سخاوت کے دریا بہاتا تھا۔ اسی طرح وہ کبھی خون کی ندیاں بھی بہا دیتا تھا۔ جس میں ڈوبنے والے غیر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنے ہوتے تھے۔ اپنے ہی عزیز رشتہ دار ایک دوسرے کے قاتل۔ ایک دوسرے کے حق میں جلاد اور درندے بن جاتے تھے۔

ہمیں یہاں بادشاہت کی تاریخ لکھنی نہیں ہے کہ ثبوت کیلئے مثالیں لکھیں ہمیں بزرگان پانی پت اور سردست حضرت قلندر صاحب کے کچھ حالات لکھنے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے اس زمانہ کی بادشاہت کا مختصر سا نقشہ کھینچنا ہے۔ تاکہ یہ معمہ حل ہو سکے کہ ہندو بھائیوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی اتنی عقیدت کیوں ہے کہ سینکڑوں سال اور پچاسوں پشتیں گذر گئیں اور یہ عقیدت ختم نہیں ہوئی۔

حضرت قلندر صاحب کے زمانہ کا سیاسی ماحول

حضرت قلندر صاحب کے

بچپن میں اس خاندان کی بادشاہت تھی جس کو غلاموں کا خاندان کہا جاتا ہے اور اتفاق سے اس زمانہ میں وہ بادشاہ حکمراں تھا جو صرف اس خاندان میں نہیں بلکہ دہلی کے تمام بادشاہوں میں اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی بھلائی میں مشہور ہے۔

یہ شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا "ناصر الدین محمود" تھا۔ اس نے اگرچہ دولت کے پوتڑوں میں جنم لیا تھا۔ بادشاہت کے گہوارے میں پلا بڑھا۔ اور ہمیشہ شان و شوکت کے جھولوں میں جھولتا رہا تھا۔ مگر طبیعت فقیرانہ پائی تھی ۱۲۴۶ء (۶۴۴ھ) میں اس کو بادشاہ بنایا گیا۔ بائیس سال حکومت

کی مگر اس پورے دور میں اس نے خزانہ شاہی سے اپنے لئے ایک پیسہ بھی کبھی نہیں لیا۔ اسلامی تعلیم کے مطابق اس کا عقیدہ یہی تھا۔ کہ جس کو خزانہ شاہی کہا جاتا ہے وہ بادشاہ کا نہیں بلکہ رعایا کا ہے؛ بادشاہ صرف امانت دار ہے اور محافظ۔

بادشاہ اگر اس میں سے لے سکتا ہے تو صرف اتنا جتنا کوئی ایک کارپردازِ حکومت یا رعایا کا کوئی ایک فرد لے سکتا ہے۔ بعنوان دیگر جو اوسطاً ملک کے کسی ایک باشندہ کی گذران ہو سکتی ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ اتنا بھی نہ لے۔

مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ

(سورہ نساء ع ۱)

یعنی جو مستغنی ہو (ضرورتمند نہ ہو) اس کو پاک دامن رہنا چاہیئے۔ (اس دولت کو ہاتھ نہ لگانا چاہیئے) اور جو ضرورتمند ہے وہ کھا سکتا ہے عام گذران کے حسب نمو۔

ناصر الدین نے اسی پہلی صورت کو اختیار کیا تھا۔ اس نے ملکی خزانہ سے کبھی بھی اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لئے کچھ لینا گوارہ نہیں کیا وہ بہترین خطاط اور اعلیٰ درجہ کا خوش نویس تھا۔ اس زمانہ میں خوشخطی بھی ایک شریفانہ اور اُجلا پیشہ تھا چھاپہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا۔ کتابیں کاتبوں سے اجرت پر لکھوائی جاتی تھیں۔ ناصر الدین عمر بھر یہی پیشہ کرتا رہا، وہ بہترین خط سے قرآن شریف لکھ کر اُجرت حاصل کرتا اور اپنا خرچ چلاتا تھا۔ اس نے اپنے لئے کبھی نوکر نہیں رکھا۔ کھانا اس کی بیوی خود بناتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی اور گھر کا تمام کام خود کرتی تھی۔ ایسے بادشاہ کا دورِ حکومت جس قدر بھی آسودہ اور پُر امن ہو کم ہے۔ چنانچہ اس کے بائیس سالہ دورِ حکومت میں چین اور آرام ہی کی رنگ رلیاں رہیں۔

ناصر الدین کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا یا بھائی نہیں بلکہ پُرانا رفیق "غیاث الدین بلبن" جو وزیر اعظم تھا بادشاہ بنا دیا گیا۔ کیونکہ یہی سب سے زیادہ قابل اور مستحق تھا

اور ناصرالدین کی کامیابی میں اس کی قابلیت، جانفشانی، ایمانداری اور دیانتداری کو بہت بڑا دخل رہا تھا۔

غیاث الدین بلبن ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء) سے ۶۸۶ھ (۱۲۸۸ء) تک بادشاہ رہا۔

ناصرالدین محمود کی طرح غیاث الدین بلبن کا دور بھی امن سے گذرا لیکن اس کے بعد وہ پرآشوب دور شروع ہوا جس کا تصور بھی وحشت انگیز اور بھیانک ہے اس کی فتنہ سامانی اور ہولناکی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے ۱۲۸۶ء سے حضرت قلندر صاحبؒ کی وفات ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) تک صرف ۳۸ سال کے عرصہ میں دہلی کے اسی تخت پر دہلی کے اسی شاہی محل میں جو جمنا کے کنارے "کلوکہڑی" میں تھا (جہاں آج کل ہمایوں کا مقبرہ ہے) نو بادشاہوں نے سروں پر تاج رکھا جو یکے بعد دیگرے خود اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاتھوں قتل کردیئے گئے۔ اور ایسی عبرتناک صورت سے کہ مثلاً شائستہ خاں (جس نے بعد میں اپنا نام فیروزشاہ رکھا) اس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے بادشاہ معزالدین کو ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں اس کلوکیڑی کے محل میں موت کے گھاٹ اتارا، اس کی نعش جمنا میں پھنکوائی، اس کے لڑکے "شمس الدین کیومرشاہ" کو جو چند سال کا معصوم بچہ تھا قتل کرڈالا۔ پھر خود بھی صرف پانچ سال حکومت کرنے پایا تھا کہ ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء میں اپنے بھتیجے علاؤالدین کے ہاتھوں جو داماد بھی تھا کڑہ مانکپور کے قریب گنگا کے کنارے کشتی میں قتل کردیا گیا۔ فرق صرف گنگا اور جمنا کا رہا۔ نتیجہ ایک ہی رہا۔ کنواں نہیں کھاتی ہے

چاہ کندہ را چاہ درپیش۔

حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں علاءالدین کا ذکر بار بار آتا ہے۔ کہ اس کو حضرت قلندر سے عقیدت تھی۔ یہ علاؤالدین یہی بزرگ ہیں۔

بہرحال علاؤالدین کی بادشاہت ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) سے ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء)

تک نہیں سال رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو بھی زہر دیدیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ۷۱۵ھ سے حضرت قلندر صاحب کی سال وفات ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء تک یعنی صرف نو ۹ سال کے عرصہ میں چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھائے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ بیشک یہ قتل ملک میں خفیہ سازشوں کے ذریعے ہوئے۔ فوجوں کی چڑھائی نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے شہروں میں مار دھاڑ اور آبادیوں کی تباہی و بربادی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ مگر جب بادشاہ قتل ہوتا ہے تو نیا بادشاہ مقتول کے عزیزوں ہی کو نہیں بلکہ جن جن پر مقتول کی حمایت کا شبہ ہوتا ہے۔ ان سب ہی کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ اس کے وزیروں اور افسروں کو معزول، معطل اور قتل وغیرہ طرح طرح کی سزاؤں کے شکنجے میں کستا ہے۔ تاکہ اس کا رعب قائم ہو اور اس کی دھاک بیٹھے۔

ظاہر ہے اس افراتفری سے عوام میں کتنا خوف و ہراس اور کتنی پریشانیاں اور سراسیمگی پھیلتی ہے۔

اس سلسلہ میں اسی علاؤالدین کے دو قصے سُن لیجئے۔ ان سے معلوم ہوگا کہ بادشاہت کیا چیز ہے۔ اور اسلام نے اس پر کیوں لعنت بھیجی ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ شاہنشاہ (ملِک۔ ملک الاملاک) کے نام تک پسند نہیں کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان اخنی الاسماء الی اللہ ان یسمی ملک الملوک، (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔ بحوالہ ترمذی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق ملامت و نفرت ملک الملوک (شاہنشاہ) کا خطاب ہے۔

پہلا واقعہ جنگ گجرات کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔ گجرات پر حملہ کے لئے جو فوج بھیجی گئی تھی اس میں ایک کمپنی اُن تاتاری نوجوانوں کی بھی تھی جو مسلمان ہو گئے تھے۔

ان کو نو مسلم مغل کہا جاتا تھا۔ فوج کی قیادت ملک نصرت کے سپرد تھی۔ جو علاؤالدین کا مقرب اور عزیز تھا۔ گجرات فتح ہوا تو مال غنیمت کی تقسیم میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بات یہاں تک بڑھی کہ نو مسلم مغلوں نے ملک نصرت خاں کے بھائی "ملک اعزالدین" کو مار ڈالا۔ دہلی واپس ہو کر یہ قصہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا۔ بادشاہ نے تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ مجرموں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں ڈال دیا جائے۔ مگر ملک نصرت خاں اپنے اختیارات یہاں تک کام میں لایا کہ ان کے عورتوں اور بچوں کو بھی گرفتار کیا۔ اور بھنگیوں کو حکم دیا کہ شیر خوار بچوں کو پکڑ کر ان کی ماؤں اور بہنوں کے سروں پر اس زور سے پٹخیں کہ ان کے بدن پاش پاش ہو جائیں۔ (معاذاللہ)

اس قسم کا ایک اور واقعہ فتح کرناٹک اور مالابار کے بعد پیش آیا۔ بادشاہ نے نو مسلم مغلوں کو فوج سے برطرف کرنا چاہا۔ ان مغلوں نے بادشاہ ہی کو ختم کر ڈالنے کی سازش شروع کردی۔ بادشاہ کا اقبال سامنے تھا اس کو سازش کا قبل از وقت علم ہو گیا۔ پھر کیا تھا حکم دیدیا کہ پورے قلمرو میں جس قدر مغل نو مسلم ہوں سب کو ایک دن کے اندر قتل کر دیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶' ۱۷ ہزار مغل نو مسلم ایک دن میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو ذلیل اور خوار کر کے منتشر کر دیا گیا۔

بہرحال بادشاہ اور اُن کے شاہ پرست ساتھی خواہ کتنے ہی عدل وانصاف اور خدا پرستی کے تخت پر جلوہ افروز ہوں۔ مگر جب بھی اُن کی خود غرضی کی آخری تمنا یعنی بادشاہت کے لئے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ درندوں سے بھی زیادہ درندہ بن کر نمودار ہوتے ہیں اور وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں جس کا تصوّر بھی رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

یہ خود مسلمانوں کا حال تھا۔ جو اس وقت حکمراں تھے۔ اب ہندوؤں کو لیجئے۔

اگرچہ حکمراں حلقہ کے آپس کی مار دھاڑ اور کشت وخون کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اور اب مسلمانوں سے جنگ کی حالت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا کہ پورے شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اپنے پرانے راج کی یاد اُن کے دلوں میں ہمیشہ سلگتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے اُن میں اپنی مجبوری اور کمتری کا احساس قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے راجاؤں سے چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ خاص علاؤالدین خلجی کا دور تو بہت ہی زیادہ طوفانی اور ہیبت انگیز تھا۔ مہارانا چتوڑ سے علاؤالدین کی لڑائی کے قصے آج تک مشہور ہیں۔ اور راجکماری پدمنی سے علاؤالدین کے عشق ومحبت کے افسانے کو اگر شاعروں کی من گھڑت مان لیا جائے، تب بھی یہ تو صحیح ہے کہ چتوڑ فتح ہونے پر بہت سے راجپوت مردوں اور عورتوں نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ کیا عام ہندوؤں کے لئے یہ دردانگیز صورت رنج اور صدمہ کی بات نہیں تھی۔ بہرحال علاؤالدین کے حملے چتوڑ تک ہی نہیں رہے وہ اس سے پہلے دہلی سے ایک ہزار میل کرناٹک تک پہونچ کر دیوگیر پر قبضہ کر چکا تھا۔ اور وہاں کے راجہ رام دیو سے سینکڑوں من سونے کے علاوہ سات من موتی ڈیڑھ من جواہر (لعل، یاقوت، الماس، زمرد وغیرہ) وصول کر چکا تھا۔ جس سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ چکا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی لڑائیوں سے کتنی پریشانی ہندوؤں کو ہوگی اور وہ اپنے آپ کو کتنا بے پناہ سمجھتے ہوں گے۔

اس وقت ایک طبقہ تھا۔ جو ان بے پناہوں کی پناہ تھا۔ جو سب ہی انسانوں کا ہمدرد اور بے سہاروں کا سہارا تھا۔ جس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ جس کی محبت بھری گود ہر فریادی کے لئے پھیلی ہوئی تھی۔ جو یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ بچھڑے ہوؤں کو سینے سے لگاتا۔ ان کی ڈھارس بندھاتا۔ ان کی مایوسیوں کو ختم کر کے زندگی کی دشواریوں کو حل کرتا۔ یہ انھیں

اولیا یا اللہ کا طبقہ تھا جن کے پاس نہ تو فوجیں تھیں نہ حکومت کا کروفر تھا اور نہ دولت کے خزانے تھے، نہ اُن کے پاس قلعے اور محل تھے۔ مگر یہ شاہ کہلاتے تھے۔ کیونکہ بادشاہوں کی بادشاہی ظاہری دنیا پر تھی اور دلوں کی دنیا پر جو بادشاہت کرتے تھے۔ وہ یہی گدڑیوں کے لعل تھے۔ جو ہاتھ خالی تھے، مگر دولت بداماں کیونکہ ہزاروں انسان دونوں وقت ان کے لنگر خانوں سے سیر ہوتے تھے۔

یہ کچے کوٹھوں چھپروں اور جھونپڑوں میں رہتے مگر قلعہ میں رہنے والوں سے زیادہ محفوظ تھے۔ کیونکہ ان کا دشمن وہی ہوتا جو خود اپنا دشمن ہوتا۔ اور اپنی تباہی خود اپنے ہاتھوں مول لیتا۔

بادشاہ ان کے محتاج ہوتے تھے۔ کیونکہ بادشاہوں کو عوام کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور عوام ان درویشوں کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں کے جھونپڑیوں کو اپنا قلعہ سمجھتے تھے۔ اور انھیں کے کچے گھروندوں کو دربار اور درگاہ کہا کرتے تھے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بادشاہ ان سے ملاقات کی درخواست کرتے اور یہ ان سے کترا جاتے۔ بادشاہ اُن کو جاگیریں پیش کرتے اور یہ معذرت کرکے اپنا دامن جھاڑ لیتے تھے۔

انگریزوں کے زمانے میں جو مصیبتیں عوام پر آئیں۔ انگریزوں کے نہ کسی پادری نے عوام کی مدد کی اور نہ اُن کے کسی پوپ کا دامنِ رحم مظلوموں کے لئے کشادہ ہوا۔ مگر مسلمانوں کے دورِ حکومت میں حکومت کے ذمہ داروں سے جو مصیبتیں پہونچیں، یہ اللہ والے فقیر اُن مصیبتوں میں بادشاہوں کے ساتھ نہیں۔ بلکہ عام مظلوموں کے ساتھ ہوتے ان کے فریاد رس بنتے اور ان کی بگڑی کو سنوارنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

یہی رام دیو، جس کو لوٹ کھسوٹ کر علاؤالدین خلجی نے اپنا باجگذار بنایا تھا

اسی کے معاصر راجاؤں کے فرزند ہردیو، سیتل دیو، چیتل دیو اور سنبھل دیو تھے۔ "ہردیو" تو ایک فوجی افسر "خواجہ حسن علامہ سنجری" سے (جو خراج وصول کرنے کے لئے "دیوگڈھ" گیا تھا) مانوس ہوگیا تھا۔ اور خواجہ حسن کی زبانی حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء کی تعریفیں سنکر اُن کی زیارت کے لئے دہلی آیا تھا۔ مگر باقی تینوں جو ایک ہی راجہ کے بیٹے تھے اور آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ ایک عرصہ کے بعد اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر مصیبتیں جھیلتے ہوئے دہلی پہونچے تھے۔ اور ایک ہی دفعہ میں اتنے مالا مال ہوگئے کہ اُنکی ساری مصیبت دُور ہوگئی۔ اور اگرچہ حضرت خواجہ کا خود اپنا کوئی مکان نہیں تھا۔ مگر ان تینوں نے حضرت خواجہ کی معمولی مہربانی سے اپنے لئے محل تعمیر کرائے۔ اس کی تفصیل نہایت پُر لطف ہے مطالعہ فرمایئے اور ان بزرگوں کی عام شفقت و محبت کا اندازہ کرلیجئے۔

واقعہ یہ ہوا کہ سیتل دیو اور اس کے بھائیوں کو دہلی پہونچے ہوئے دو ایک دن ہی ہوئے تھے۔ کہ حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعریفیں سن کر اُن کی زیارت کے لئے خانقاہ میں پہونچے۔ حضرت کے یہاں مریدوں کا مجمع تھا۔ جہاں حضرت تشریف فرما تھے وہ سارا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دو بھائی باہر کھڑے رہ گئے اندر نہیں جاسکے۔ سیتل دیو اندر پہونچکر اس مجمع میں بیٹھ گیا۔

غربت افلاس اور مصیبتوں کے سفر کے سبب سے چہرہ جھلسا ہوا سادھو آنہ وضع۔ کپڑے پھٹے ہوئے، میلے کچیلے۔ اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ کسی ریاست کا راجکمار ہوگا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ کوئی سادھو ہے جو مجلس کی رونق دیکھنے آگیا ہے۔ اتفاق سے اسی وقت علاؤ الدین بادشاہ کے دو افسر ملک نصرت خاں اور خضر خاں بادشاہ کے بھیجے ہوئے حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ دو خادم تھے جن کے سروں پر دو تھال (طشت) تھے۔ جن پر زربفت کے خوان پوش پڑے ہوئے تھے حضرت

امیر خسرو ان کی قیادت کر رہے تھے۔ ان تینوں نے حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہونچکر بادشاہ کا سلام عرض کیا۔ خادموں کے سروں پر سے تھال اتار کر حضرت کے سامنے رکھے اور اُن کے خوان پوش ہٹائے۔ دونوں تھال آبدار موتیوں سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ حضرت نے ان دونوں تھالوں کو دیکھا۔ اور خاموش رہے ان شاہی افسران نے یہ ہدیہ پیش کرنیکے بعد اجازت چاہی اور واپس چلے گئے۔ حضرت خواجہ کا ایک خادم جس کا نام اقبال تھا وہ سامنے آیا۔ اور دونوں تھالوں کو اٹھوانے لگا۔ کہ اس فقیر نے جو سادھوانہ لباس میں تھا۔ اور کچھ فارسی عربی سیکھ چکا تھا۔ بلند آواز سے کہا "یا بانظام الہدایا مشترک" یہ عربی زبان کا مقولہ اس سادھو کو یاد تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مجمع میں جو ہدیہ پیش ہو اس میں سب کا حصہ ہونا چاہیئے یہ درست نہیں کہ تنہا صاحب مجمع اس چیز کو استعمال کرے۔ اس طرح لطیف پیرایہ میں اس سادھو نے کچھ موتی مانگے۔

حضرت خواجہ نے فوراً جواب دیا "بل تنہا خوشترک" یعنی پورا مجمع نہیں بلکہ صرف تنہا آپ کے لئے یہ ہدیہ بخوشی پیش ہے۔ سادھو نے اول اس کو مذاق سمجھا۔ مگر حضرت خواجہ نے دوبارہ پوری سنجیدگی سے فرمایا کہ یہ دونوں تھال آپ ہی کے ہیں۔

جب سادھو کو یقین ہو گیا کہ یہ دولت اس کو صرف اس کے ایک فقرہ پر عطا کر دی گئی تو ان کو اُٹھانے کے لئے آگے بڑھا۔ حضرت خواجہ نے حاضرین سے فرمایا۔ اس قلندر سے دونوں تھال نہیں اُٹھیں گے کوئی ان کی مدد کرے۔ اس مجمع میں "ہر دیو" بھی موجود تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر یہ تھال اٹھوائے اور اس خیال سے ساتھ ساتھ چلے کہ اس کو باہر جاکر سمجھا دیں کہ یہ بہت قیمتی موتی ہیں۔ ان کو یوں ہی کسی معمولی قیمت پر نہ دیدینا۔ ہر دیو خود جوہری تھا۔ وہ جوہر کی قدر جانتا تھا جب یہ دونوں باہر نکلے تب ہر دیو نے سادھو کو غور سے دیکھا تو اس کو شبہ ہوا کہ یہ اس

کی جان پہچان کا کوئی آدمی ہے اور وہ اس کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ غرض باہر نکل کر بات چیت شروع ہوئی تب ہردیو کو معلوم ہوا کہ یہ اسی کے وطن کا راجکمار ہے جو گردش زمانہ سے گرتا پڑتا کسی طرح یہاں پہونچا ہے۔ ہردیو جب باہر نکلا۔ تو وہاں سیتل دیو کے دونوں بھائی بھی تھے اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔

مختصر یہ کہ یہ راج کمار جو بادشاہ کے اقدام سے تباہ ہو چکے تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی معمولی توجہ سے پھر دولت مند ہو گئے۔ اور جو اپنی زندگی سے آزردہ ہو چکے تھے۔ جن کے لئے زندگی بوجھ بن گئی تھی۔ وہ معمولی نظر لطف وکرم کے طفیل میں عیش وآرام کے جھولے میں جھولنے لگے اور ان کی زندگی سدا بہار بن گئی۔

یہ ایک واقعہ ہے اس قسم کے بہت سے واقعات تاریخ کے اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ درویش بے گدا، بے نوا یہ فاقہ مست اولیاء اللہ جو خود جو کی سوکھی روٹی کھا کر زندگی گذارتے تھے۔ دوسروں کے لئے خصوصاً بادشاہوں کے ستائے ہوئے مصیبتوں کے مارے ہوئے دُکھی انسانوں کے لئے ابر رحمت اور بخشش وسخاوت کے دریا بے پایاں ہوا کرتے تھے۔

یہ کیا چاہتے تھے؟ یہ بھی سن لیجئے:۔

اسی واقعہ کو لیجئے۔ اگلے روز جب ہردیو نے آکر پھر حضرت خواجہ کو ان سادھوؤں کی حقیقت بتائی کہ یہ اسی ملک کے راج کمار ہیں۔ جہاں سے علاؤالدین بادشاہ سات من موتی لے کر آیا ہے تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔

ہردیو سنو! اللہ تعالیٰ کی شان نرالی ہے۔ ہر دن اس کی شان جُدا ہوتی ہے۔ ایک شان ہے کہ ایک سے دوسرے کو دلوایا۔ دوسری شان یہ ہے کہ جس کو دلوایا تھا۔ اُس نے اُس کو واپس کر دیئے جس کے یہ موتی تھے۔

دیکھو ۔ باہر دیویہ موتی سمندروں کی تہہ میں سیپ کے پیٹ میں پیدا ہوئے غوطہ لگانے والوں نے سیپ دریا سے نکالے اُن کا جگر چاک کر کے اُن سے موتی نکالے، موتی بازار میں بکے ۔ جوہریوں سے امیروں نے خریدے ۔ امیروں سے بادشاہوں نے چھینے ۔ بادشاہوں سے یہ موتی درویشوں کے یہاں آئے ۔ درویشوں نے دیکھا کہ ان کے دل میں ان موتیوں کی کوئی جگہ نہیں ہے ۔ کیونکہ وہاں خدا کی محبت کے بہت سے آبدار موتی بکھرے ہوئے ہیں ۔ بس درویشوں نے یہ موتی اُن کے حوالے کر دیئے جن کو ان کی ضرورت تھی ۔ جو کہہ رہے تھے کہ موتی ہمارے اور ہم موتیوں کے ہیں ۔ ہم نے اُن کے دلوں کی آواز سُنی ۔ ہم نے کہا موتی تمہارے ہی ہوں گے ۔ مگر تم موتیوں کے ہرگز نہیں ہو ۔ کیونکہ ہر آدمی خدا کے لئے پیدا ہوا ہے ہم نے موتی دیدیئے حق بحق دار رسید ۔ مگر ہم نے مفت نہیں دیئے ۔ ان موتیوں کے بدلے ہم نے تین دل لے لئے ، دل کی محبت موتیوں سے کہیں زیادہ ہے ۔ ایک دل پوری دنیا اور مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے ۔ دل رب ذوالجلال کا جلوہ گاہ ہے اس کو جیت لیا تو پوری دنیا کو جیت لیا ۔

یہ ہے درویش کا تصور ۔

یہی دل جو بادشاہ کی نظر میں گھاس کے تنکے کی برابر بھی نہیں جس کو وہ جب چاہتا ہے مسل دیتا ہے ۔

یہی دل درویش کی نظر میں پوری دنیا اور اس کی تمام دولتوں سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ یہ انسانیت و شرافت کا مرکز اور اُس کے محبوبِ حقیقی کی جلوہ گاہ ہے،

بیشک ان درویشوں اور قلندروں کو اپنے خدا سے محبت تھی، یہ خدا کے سچے عاشق تھے ۔ اور اُسی کے عشق میں رات دن مست رہتے تھے ۔ ایسے مست کہ اُن کو اپنے تن من کی خبر نہ رہتی تھی نہ اپنے فرزند و زن کی ۔ مگر یہ عشق خدا عشق

خلق خدا کے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا ۔

اُن کی بارگاہ میں نیک و بد، اچھے بُرے، مسلمان اور ہندو کا سوال نہیں تھا، بلکہ جو بُرا ہوتا تھا اس سے ان کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ بزرگ انسانیت اور روحانیت کے طبیب حاذق ہوتے تھے۔ بُرے آدمی روحانیت کے مریض اور بیمار، طبیب اور ڈاکٹر بیماروں سے نفرت نہیں کرتے بلکہ جو زیادہ بیمار ہوتا ہے اس سے اُن کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی ہیں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکّہ اور جنگ حنین کے بعد مال غنیمت تقسیم کیا تو مکہ کے ان سرداروں کو زیادہ انعامات دیئے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور وفادار انصار کو (جنھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا) یہ فرما کر مطمئن کر دیا "کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مکہ کے یہ لوگ دنیا کا مال و متاع لیکر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے محبوب) کو لیکر اپنے وطن واپس ہو"

یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے نہاں خانہ دل میں اللہ کی محبت کے بعد اگر کسی کی محبت تھی تو وہ اس کے رسولؐ اور نبیؐ تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اپنے نبی اور رسول کا بتایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہ یعنی عاشق اپنے معشوق اور محبوب کا رنگ ڈھنگ اختیار کیا کرتا ہے اس کو اپنے محبوب کی خصلتوں سے بھی ایسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا کہ اپنے محبوب سے۔ بس تمہیں اللہ سے عشق ہے تو تم اللہ کی خصلتیں اپنے اندر پیدا کرو۔ اور انھیں خصلتوں کو اپنا محبوب و معشوق بنا لو۔

اللہ تعالیٰ کی خصلتیں کیا ہیں؟ اس کی پہلی خصلت یہ ہے کہ وہ رب العلمین ہے۔ یعنی اچھے بُرے، مسلمان غیر مسلمان، انسان غیر انسان سب کا رب، سب کا

پالنہار یعنی وہ اپنے سے بے نیاز ہے۔ لیکن ہر ایک کا کارساز۔ وہ خود نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے نہ راحت و آرام کی اس کو ضرورت ہے۔ مگر ہر ایک کے لئے رزاق ہے، روزی رساں ہے۔ ہر ایک کے لئے راحت و آرام کے سامان مہیا کرتا ہے وہ ارحم الراحمین ہے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل، ہر ایک پر رحم کرتا ہے۔

بس ان بزرگوں کا نصب العین بھی یہی تھا۔ یعنی اپنی فکر نہیں، ہر ایک کی فکر، خود اپنے سے بے نیاز، اور ہر ایک کے کام آنے والے، ہر ایک کے لئے رحم و کرم کے دیوتا۔ ہر ایک کے کارساز۔

ان بزرگوں نے قرآن شریف سے یہ سبق لیا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوع انسان کے ساتھ وہ ہمدردی تھی کہ اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں خود اپنی جان کی فکر سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ وہ خلق خدا کی ہمدردی اور غمخواری میں اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان کی تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اپنی جان قربان کردیں۔ اپنے تن، من، دھن کو اس کی راہ میں کھپادیں۔ وہ اسی کے لئے رات دن بے چین رہتے تھے۔

ان بزرگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کر کے یہی سوز و گداز، یہی ہمدردی، اسی طرح عوام کے لئے کھپنا، ان کے غم میں گھلنا سیکھا تھا۔ اور اسی غمخواری خلق اللہ نے ان کو خلق خدا کا محبوب بنا دیا تھا۔ بس یہ ایک قدرتی بات تھی کہ جس طرح ان کو انسانوں سے محبت تھی۔ انسانوں نے ان سے محبت کی۔ نہ صرف زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی محبت کی اور کر رہے ہیں۔ سیکڑوں برس کی تاریخ نے ہزاروں لاکھوں واقعات پر پردہ ڈال دیا۔ مگر جس حقیقت پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ ان درویشوں کی محبت ہے۔

لاکھوں باتیں انسانی ذہن سے محو ہو گئیں۔ دلوں کی تختیوں پر ان کے

مٹے ہوئے نشان بھی باقی نہیں رہے۔ مگر ان بزرگوں کی محبت کچھ اس طرح پتھر کی لکیر بن چکی ہے کہ نہ آج تک مٹی ہے نہ آئندہ مٹے گی۔ جس طرح ان پاک بندوں نے عشقِ خدا اور ہمدردیٔ خلقِ خدا میں ابدی زندگی حاصل کی۔ اسی طرح ان کی محبت ان کے دلوں میں زندہ و جاوید ہوگی۔ جن کے لئے یہ مٹے تھے اور فنا ہوئے تھے۔

بادشاہ کے متعلق ان بزرگوں کے خیالات

راج کمار "ہردیو" سے آپ واقف ہو چکے ہیں۔ یہ حضرت سلطان الاولیاءؒ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اور جب موقع ملتا تو حضرت امیر خسرو کی باتوں سے دل بہلایا کرتے تھے۔ ہردیو کی ایک ڈائری بھی ہے جس میں وہ روزمرہ کے واقعات اور ملفوظات لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک مجلس کی دلچسپ گفتگو آپ بھی سن لیجئے۔ اس سے ان بزرگوں کی اپنی زندگی کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ ان کے خیالات بادشاہوں کے متعلق کیا ہوا کرتے تھے۔

ہردیو۔ میں نے کہا حضرت (سلطان الاولیاءؒ) دن بھر روزے رکھتے ہیں اور رات کو فقط جو کی روٹی کھاتے ہیں اس سے ان کی جسمانی طاقت بہت کم ہو جانے کا ڈر ہے۔

حضرت امیر خسرو نے جواب دیا۔ خدا کی یاد اُن کے جسم کی طاقت کے لئے کافی ہے۔

ہردیو کہتے ہیں۔ میں نے امیر خسرو سے علاؤ الدین خلجی کی بُرائی کرنی شروع کی اور کہا کہ وہ بہت ہی بُرا بادشاہ ہے۔

امیر خسروؒ نے میری بات سُنی تو وہ بہت ہنسے اور انھوں نے کہا "ہردیو" تو نے کبھی کسی ڈاکو کو دیکھا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ایک نہیں بہت سے ڈاکو

دیکھے ہیں۔ امیر خسرو نے پوچھا ڈاکو کس کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا جو دوسروں کا مال لوٹ لے اور جان لے لے۔ عورتوں اور بچوں پر رحم نہ کرے اس کو ڈاکو کہتے ہیں

امیر خسرو نے مسکرا کر کہا۔ کہ اور تو نے یہ بھی سنا ہوگا کہ ڈاکو سوائے اس گناہ کے کہ وہ دوسروں کا مال لوٹ لیتے ہیں اور بغیر رحم کے دوسروں کو مار ڈالتے ہیں۔ اور زخمی کر دیتے ہیں۔ اور برائیاں اُن میں نہیں ہوتیں مثلاً وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہی ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ وہ اپنا لوٹا ہوا مال غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے ہیں۔ مہمانوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے ہیں لاوارث عورتوں اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔ اور ہر وقت خدا کی مخلوق کو فائدہ پہونچاتے رہتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ اور اگر ہندو ہوں تو ہمیشہ مندروں میں جاتے ہیں۔ گنگا میں نہاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ ان ڈاکوؤں کی یہ اچھی باتیں اچھا کہنے کے قابل ہیں یا نہیں۔؟

میں نے جواب دیا۔" جو اچھی بات ہے وہ اچھی بات ہے اور جو بُری بات ہے۔ وہ بُری ہے۔ پس ڈاکہ مارنا بُرا ہے اور جتنے کام آپ نے بتائے وہ سب اچھے۔

امیر خسرو نے کہا کہ اگر میں کسی ڈاکو کے نیک کاموں کی تعریف کروں تو تم یہ تو نہیں کہوگے کہ وہ ڈاکو ہے بے رحم ہے۔ اس کی اچھی بات کی تعریف نہ کرو۔ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ سب بادشاہ ڈاکو ہوتے ہیں۔ اور بہت بڑھیا قسم کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ دوسروں کا ملک چھین لیتے ہیں۔ ان کو مفلس و کنگال بنا دیتے ہیں۔ اور ان کی عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔ مگر اس عیب کے سوا ان میں ہزاروں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں روزے بھی رکھتے ہیں۔ خیرات بھی کرتے ہیں، بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ننگوں کو کپڑے بانٹتے ہیں۔ اور کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جب ان کو شک ہو جاتا ہے کہ کسی شخص سے ان کی

بادشاہی کو خطرہ ہے تو پھر وہ رحم اور انصاف کو بھول جاتے ہیں۔ چاہے وہ شخص پیر ہو یا اُن کا باپ ہو یا اُنکی ماں ہو یا اُنکی اولاد ہو یا اُنکا بھائی ہو۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور سب کو فنا کر دینا اپنا بادشاہی کا ایمان و قانون سمجھتے ہیں۔

یہی حال علاؤالدین خلجی کا بھی سمجھو کہ وہ بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک بڑا ڈاکو ہے۔

ہر دیو! تم دہلی میں ابھی نئے آئے ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ خود مختار بادشاہوں کے پایۂ تخت میں زندگی بسر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ چند روز کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ علاؤالدین کے اکثر مصاحب اور اکثر بڑے بڑے امیر اور فوجی سردار میرے حضورؒ کے مرید ہیں۔ سوائے چند آدمیوں کے کہ وہ فقط بادشاہ کے مرید ہیں۔ اور بادشاہ کے سوائے ان کو خدا کی ضرورت ہے نہ رسولؐ کی ضرورت ہے وہ اگر کبھی خدا کو یاد کرتے ہیں تو فقط اس لئے کہ بادشاہ ان کو خدا پرست سمجھے، وہ رسولؐ سے محبت ظاہر کرتے ہیں تو اس لئے کہ بادشاہ کو بھی رسولؐ سے محبت ہے۔ وہ دلی کے پیروں کے پاس چلے جاتے ہیں، زمین پر سر جھکاتے ہیں۔ ان پیروں کو نذریں دیتے ہیں۔ اُن پیروں سے دعائیں کراتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بادشاہوں کی نوکری کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ایسے سب لوگوں سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ جن کا عوام پر اثر ہے۔ یہ ایک طرف پیروں کے قدموں میں سر رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف بادشاہ کے یہاں انھیں پیروں اور بزرگوں کی مخبری کرتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی اس گفتگو سے اندازہ کیجیئے کہ یہ بزرگ اور اُن کے مصاحبین شکستہ دل اور دُکھی انسانوں کی کس طرح دلداری کیا کرتے تھے عربی زبان کی یہ مشہور کہاوت بالکل صحیح ہے کہ "اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ"

یعنی" احسان کے جواب میں انسان غلام بن جاتا ہے " ان بزرگوں کے بھی احسانات ہوتے تھے جو احسان شناس انسانوں کو" بندۂ بے دام" بنا لیتے تھے۔ ان کی محبت اور گرویدگی دل کے ہر ایک گوشہ اور بدن کے ہر ایک رگ پٹھے میں یہاں تک سرایت کر جاتی تھی کہ آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ یہی اثرات ہیں جو پشتیں گذر جانے کے بعد بھی اُن کے اندر موجود ہیں جن کے دادا پردادا پشتہا پشت پہلے ان بزرگوں کے احسانات سے متاثر ہوئے تھے۔

باب اوّل

حضرت شاہ بو علی قلندرؒ

خاندان اور نسب

آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے، دین و مذہب کے سب سے بڑے مزاج شناس، وحی الٰہی کے عظیم المرتبت مفکر، منشار شریعت کے سب سے بڑے مبصر مذہبی قانون کے سب سے بڑے نکتہ داں، تفقہ فی الدین کے جلیل القدر مقتدا امام اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ورضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے والد ماجد کا اسم گرامی فخر الدین ہے۔ چند پشتوں سے غالباً فوجی خدمات کی وجہ سے سالار کا خطاب، نام کا جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ فخر الدین صاحب بھی سالار فخر الدین کے نام و خطاب سے مشہور ہیں۔ اور اُن کے والد ماجد اور جد امجد کو بھی سالار لکھا جاتا ہے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلۂ نسب یہ ہے۔

شیخ شرف الدین بو علی قلندر خلف سالار فخر الدین بن سالار حسن بن سالار، عزیز بن ابو بکر غازی بن فارس بن عبد الرحمٰن بن عبد الرحیم بن محمد بن وانک بن امام نعمان ابو حنیفہ کوفی بن ثابت بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (سیر الاقطاب ص ۳۲۷)

والدہ ماجدہ کا اسم گرامی جمال بی نہایت متقی، با اوقات عابدہ و زاہدہ اللہ تعالیٰ نے حفظ کلام اللہ شریف کی دولت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس لئے آپ کو بی بی حافظہ جمال

کہا جاتا ہے۔ (خزینۃ الاصفیار صـ۳۲۷)

ننھیالی سلسلہ

شیخ محمد ابن احمد بن عثمان پانی پتی تیرہویں صدی ہجری کے صاحبِ قلم ہیں وہ حضرت قلندر صاحبؒ کے ہم جد ہیں۔

یعنی قلندر صاحب کے برادر بزرگ حضرت نظام الدین صاحب عراقی کے اخلاف میں سے ہیں۔ آپ نے حضرت قلندر کے حالات و مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اور حضرت قلندر صاحب کے اسم گرامی کی نسبت سے اس کا نام "شرف المناقب" تجویز فرمایا ہے۔ تصنیف کی تاریخ اور سنہ کا تو علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ایک نسخہ جو حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی نے بڑی احتیاط سے احقر کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے۔ بتاریخ نہم ماہ صفر ۱۲۵۳ھ نسخۂ ہذا شرف المناقب۔ مطابق ۱۲۴۵ فصلی وقت سعید ختم شد۔ کاتب لعاصی و مالک ہذا الکتاب بندۂ ضعیف شیخ محمد یٰسین پانی پتی عفی عنہٗ۔"

بہرحال جب یہ قلمی نسخہ آج (۱۳۸۱ھ) سے ۱۴۸ سال پُرانا ہے۔ تو تصنیف تو تقریباً دو سو برس پیشتر کی ہوگی۔

یہ شیخ محمد بن احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

شیخ فخر الدین صاحب عراقی کو حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اللہ سرہ العزیز سے شرفِ دامادی حاصل تھا لیکن یہ اہلیہ لاولد فوت ہوگئیں تو حضرت فخر الدین صاحب ہمدان تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ سے آپ نے عقد کر لیا۔ آپ اس حرم کو ساتھ لے کر عراق تشریف لیگئے۔ وہاں اس حرم سے آپ کو ایک فرزند نصیب ہوا۔ آپ نے اس کا نام "نظام الدین" رکھا۔ نظام الدین صاحب نے عراق ہی میں پرورش پائی۔ جب آپ کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو والدین سے اجازت لے کر بسلسلہ تجارت ہندوستان تشریف

لائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے گھوڑوں کی تجارت شروع کی اور ہندوستان گھوڑے لے کر آئے تھے۔ بہر حال جب آپ پانی پت پہونچے تو اس شہر اور اس کے قرب وجوار کے سرسبز وشاداب خطوں نے آپ کا دل موہ لیا۔ آپ یہیں رہ پڑے۔ کچھ دنوں بعد والدین سے بھی نہیں رہا گیا۔ اور وہ بھی یہیں پانی پت اپنے فرزند رشید نظام الدین صاحب کے پاس آگئے۔ یہیں حضرت شیخ بو علی قلندر کی ولادت ہوئی۔

شیخ فخر الدین کے متعلق " جامع العلوم " کے حوالے سے لکھا ہے :۔

" دانشمند کامل حال بود۔ در علم معقول و منقول ممتاز و مشہور "

(ترجمہ :۔ بہت بڑے صاحب عقل وہوش اور باکمال بزرگ تھے۔ جو عقلی اور نقلی علوم میں نہایت مشہور اور ممتاز تھے)

اس کے بعد آپ کے ملتان پہونچنے کا ایک نہایت عجیب واقعہ لکھا ہے کہ آپ اپنے مدرسہ میں تشریف فرما تھے۔ کہ قلندروں کا ایک گروہ آیا۔ شیخ نے ان کی خاطر مدارات کی۔ ان میں ایک نوجوان سے آپ کو آشنا انس ہوگیا کہ جب یہ قافلہ روانہ ہوا۔ تو آپ اس کے ساتھ ہولئے۔ دو چار روز اپنی اصلی وضع پر رہے۔ پھر ان قلندروں نے کہا کہ اگر آپ اس نوجوان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ آپ بھی چار ابرو کا صفایا کریں اور ہماری وضع اختیار کرلیں۔

شیخ فخر الدین کچھ اس درجہ وارفتہ تھے کہ یہ شرط قبول کرلی۔ یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا خراسان سے ملتان پہونچ گیا۔ یہاں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا دسترخوان اتنا وسیع تھا کہ روزانہ سینکڑوں درویش آپ کے لنگر خانے سے کھانا کھاتے تھے۔ یہ قافلہ بھی حضرت خواجہ ملتانیؒ کے وسیع دسترخوان سی فیض یاب ہوا۔

حضرت خواجہ، مولانا فخر الدین صاحبؒ عراقی سے کسی طرح پہلے سے واقف تھے یا آپ نے نظر کشفی سے ان کو تاڑ لیا تھا۔ بہر حال حضرت شیخ ملتانی کو شیخ

فخرالدین کی موجودہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ آپ نے مولانا فخرالدین صاحب کو تخلیہ میں طلب فرما کر گفتگو کی۔ اور توجہ باطنی سے ایسا تصرف کیا کہ مولانا فخرالدین صاحب کو اس حالت سے نجات مل گئی اور یہ عالمِ سکر ختم ہوا۔ اب شیخ فخرالدین حضرت خواجہ بہاءالدینؒ کے ممنون احسان بھی تھے اور حد درجہ معتقد بھی، جس کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ آپ نے حضرت خواجہ ملتانی سے بیعت ہونے کی درخواست کی جو منظور ہوئی، اور آپ داخل سلسلہ ہو گئے۔

طبیعت کی یکسوئی اور مقصد کے لئے جذبۂ فنا، عشق مجازی میں حاصل ہو چکا تھا۔ صرف رُخ بدلنے کی دیر تھی۔ حضرت خواجہ ملتانیؒ کے فیض تصرف سے وہ رُخ بدل گیا۔ تو چند روز ہی میں مراحل سلوک طے کر کے درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ خود حضرت بہاءالدینؒ نے آپ کو دامادی کے لئے منتخب فرما لیا۔

یہ ایک رُخ تھا کہ کس طرح عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہونچے۔ اور یہ کہ حضرت خواجہ بہاءالدین نے کس طرح آپ کے کمال کی قدر کی، یہاں تک کہ اپنی نورچشم کو آپ کے حبالۂ عقد میں منسلک کر دیا۔

اب ایک اور لطیفہ کمال احتیاط کا ملاحظہ فرمایئے۔ اگر ادب مانع نہ ہو تو آپ اس کو "تقشف" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ان صاحبزادی صاحبہ کی وفات ہو گئی تو حضرت خواجہ بہاءالدین صاحب نے چاہا کہ دوسری لڑکی انھیں سے منسوب فرما دیں۔ آپ نے اپنے فرزند رشید حضرت خواجہ صدرالدین صاحب سے مشورہ فرمایا۔

حضرت خواجہ صدرالدین صاحب نے سختی سے مخالفت کی۔ مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے خیال میں شیخ فخرالدین صاحب "بندۂ نفس" تھے۔ دلیل یہ بیان فرمائی کہ:

"ایک روز میں خانقاہ کے مہمان خانہ میں کھڑا ہوا تھا۔ صبح کا وقت

تھا۔ میں نے بھائی فخرالدین صاحب کو دیکھا کہ کرتا اُتارے نسیم صبا سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ جو شخص اس درجہ حظِ نفس میں مبتلا ہو۔ اس کو پہلے ہی لڑکی دینی مناسب نہیں تھی۔ چہ جائیکہ دوسری لڑکی بھی اسی کے حوالہ کر دی جائے۔"

والد صاحب نے بہت سمجھایا کہ میاں صدرالدین یہ حظِ نفس ایسا نہیں جو ناجائز ہو۔ فخرالدین صاحب کے لئے اتنا حظِ نفس مباح ہے۔ مگر صدرالدین صاحب راضی نہیں ہوئے۔ بالآخر والد صاحب نے بھی صاحبزادے کی مرضی کے خلاف نکاح کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔

اب شیخ فخرالدین صاحب آزاد ہو گئے تو حضرت شیخ سے رخصت ہو کر ہمدان پہونچے۔ وہاں سید نعمت اللہ صاحب ہمدانی کی بہن سے دوسرا نکاح کیا۔

پیٹ کھول کر گھومنا یا کرتا اُتار دینا تنہائی میں یا مجمع میں شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کا پیٹ اور پیٹھ ستر میں داخل نہیں ہے۔ جس کا کھولنا ناجائز ہو۔ البتہ مجمع میں خلاف ادب ہے۔ لیکن حضرات صوفیا کرام کا نصب العین نفس کشی ہوتا ہے ان کے اصول کے مطابق اس طرح کا حظِ نفس بھی ممنوع ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشائخ طریقت کیسے کیسے مجاہدے اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔

سید نعمت اللہ صاحب کے متعلق شرف المناقب میں تحریر ہے کہ:۔

"سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کہ مرقدش ظاہر اور قصبہ ہانسی است۔"

(ترجمہ:۔ سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی جن کا مزار بظاہر قصبہ ہانسی میں ہے)

لیکن یہ تفصیل نہیں ہے کہ ہانسی میں یہ پہلے سے تھے یا بعد میں تشریف لائے ہانسی مشرقی پنجاب کا ایک مشہور قصبہ ہے۔

سید نعمت اللہ صاحب کی ہمشیرہ جو شیخ فخر الدین صاحب سے منسوب ہوئیں۔ وہ حافظ قرآن تھیں نہایت متقی، پابند اوقات، ذاکر و مشاغل۔ غالباً جمال النسار نام ہوگا۔ حافظہ بی بی جمال کے نام سے مشہور رہوئیں۔

صاحب شرف المناقب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے معتبر حضرات کا خیال ہے کہ حضرت شاہ شرف بو علی قلندر پانی پتی۔ حضرت قطب جمال ہانسوی، سلطان شاہ فرخ گوہانوی اور شاہ صوفی کیتھلی یہ سب خالہ زاد بھائی ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح ہو جانا چاہیئے کہ پانی پت، ہانسی، حصار، گوہانہ، کیتھل یہ سب مشرقی پنجاب کے قصبات ہیں اور ایک دوسرے سے تقریباً بیس ۲۰ بیس ۲۰ میل کے فاصلہ پر یا اس سے کچھ کم و بیش ہیں۔

سال ولادت

حضرت شیخ فخر الدین صاحب اس دوسرے عقد کے بعد ۶۰۰ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ اور تشریف آوری سے چار سال بعد ۶۰۵ھ میں دوسرے فرزند پیدا ہوئے جن کا نام شرف الدین رکھا گیا۔ بعد میں پورا نام یہ ہوگیا "شیخ شرف الدین بو علی قلندر قتال"

ولادت کے بعد کثرت گریہ اور تسکین کی عجیب و غریب صورت

شرف المناقب کی روایت ہے کہ ولادت کے بعد تین دن ایسے گزرے کہ یہ ہونے والے قلندر برابر روتے ہی رہے۔ تیسرے روز شیخ فخر الدین صاحب نے مکان کے دروازے پر ایک "چرم پوش" درویش کو دیکھا، سلام کیا۔ درویش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"مبارک ہو، لڑکا ہوا ہے میں اسی کو دیکھنے کے لئے منتظر کھڑا ہوں۔

فخر الدین صاحب درویش کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ درویش نے بچہ کو دیکھا تو پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر دونوں کانوں میں یہ آیت پڑھی"

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ۔(جس طرف کو منہ کرلو ادھر ہی اللہ ہے)
اس آیت کی آواز جیسے ہی کانوں میں پڑی گریہ موقوف ہوگیا، آنکھیں کھل گئیں اور دودھ چوسنا بھی شروع کردیا۔

درویش صاحب نے شیخ فخرالدین صاحب کو بشارت دی کہ یہ بچہ صاحب کمال عاشق خدا ہوگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ درویش نظروں سے غائب ہوگئے۔

تعلیم

فارسی آپ کی مادری زبان تھی اور عربی علمی اور قانونی زبان، آپ دونوں زبانوں کے ماہر تھے۔ اور اس زمانہ میں جو علوم وفنون ایک فاضل کے لئے ضروری مانے جاتے تھے۔ آپ نے ان میں بھی دسترس حاصل کی۔ شعروسخن متمدن اور مہذب انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے اور جذبۂ عشق اس سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ آپ کا ادبی ذوق ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے آپ کا کلام نہایت سلیس، پُرمعنی اور پُرمغز، یعنی سہل ممتنع، آپ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ اس وقت میرے سامنے ہے اور غالباً یہ مطبوعہ بھی ہے۔ مگر عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کی مثنوی یہاں تک مشہور اور متداول ہے کہ اب سے تقریباً پچاس سال بیشتر تک وہ کریما سعدی کی طرح فارسی کے ابتدائی کورس میں داخل تھی۔

اساتذہ

آپ کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہیں۔ بظاہر آپ نے پانی پت ہی میں وہاں کے اساتذہ سے تعلیم پائی۔ شرف المناقب کے ایک جملہ سے آپ کے ایک استاذ مولانا سراج الدین مکی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ جو آپ کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک زندہ رہے اور بروایت مصنف "شرف المناقب" دوسوتیس ۲۳۰ سال کی عمر پائی۔

"مولانا سراج الدین مکی کہ استاد آں عاشق الٰہی بود دو صد

وسی سال عمر شان بود۔"

پانی پت سے دہلی اور سلسلہ درس و قضا

عمر عزیز کے چالیس سال آپ نے اسی پانی پت میں گذار دیئے جہاں کی گلیوں اور کوچوں میں آپ نے بچپن کے دن گذارے تھے۔ پھر آپ دہلی تشریف لائے۔ سب سے پہلے آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہٗ کی درگاہ میں حاضر ہوئے اور مسجد میں پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کیا۔ خود آپ کی تحریر ہے۔

"چوں ایں درویش ضعیف الضعیف فقیر الحقیر شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی از خطہ پانی پت در شہر دہلی رفت در مقام خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز در نماز گاہ دوگانہ گذاردم و سر بسجدہ بُردم۔"

ترجمہ:۔ جب یہ ضعیف وکمزور فقیر وحقیر شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی۔ پانی پت سے دہلی پہونچا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیامگاہ پر پہونچکر دوگانہ شکر ادا کیا اور سر بسجود ہوا۔

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں:۔

"آں روز عمر ایں درویش چہل سالہ بود در مینارہ دہلی سکونت کردم۔ و آنچہ مطلوب بود از خدائے تعالیٰ خواستم۔"

ترجمہ:۔ اس وقت اس درویش کی عمر چالیس سال تھی۔ دہلی کے مینارہ ...... (قطب مینار) کے علاقہ میں، میں نے سکونت اختیار کی۔ اور اللہ تعالیٰ سے اپنے مقصود میں کامیابی کی دعا کی۔"

مگر صرف مینارہ دہلی میں سکونت ہی نہیں، بلکہ سوانح نگاروں نے تو یہ لکھا ہے کہ آپ نے مسجد "قوت الاسلام" کو درس و تدریس کا مرکز بنا لیا۔ اور چالیس برس

سال "قطب مینارہ" کے نیچے درس وتدریس میں گذار دیئے۔

اتنے طویل عرصہ تک درس وتدریس کا سلسلہ اس دور میں جب اللہ اور رسولؐ کے بعد استاد اور رہبری کا درجہ مانا جاتا تھا اس کے اثرات لامحالہ یہ ہوتے تھے کہ دہلی کے تمام علمی اور سیاسی حلقوں میں آپ کی عزت وعظمت کا سکہ جم جائے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امرائے دولت اور ارباب حکومت بھی یہاں تک متاثر تھے۔ کہ انھوں نے پایۂ تخت کا منصب قضا (ججی) آپ کے سپرد کر دیا۔ پھر آپ بیس[۲۰] سال تک فرائض قضا پوری احتیاط اور دیانت سے انجام دیتے رہے۔ مگر آپ نے خود اپنی تحریر میں جس کا عنوان حکمنامہ ہے۔ چالیس سال تک درس وتدریس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اہل علم ودانش اور ارباب فقر کے حلقہ میں جو عظمت آپ کو حاصل تھی۔ اور اس وقت کے نامور مشائخ اور علمار وفضلا جس طرح آپ کو اپنا مسلّم مقتدا اور پیشوا سمجھتے تھے اس کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

جمیع درویشان ودانشمندان جمع شدہ بایں درویش گفتند۔ کہ میان ما[ل] "بزرگ" توئی۔ مولانا وجیہ الدین پائلی۔ مولانا ظہیر الدین بخاری۔ مولانا صدر الدین وشریعت الدین ومولانا فخر الدین ناقلی ومولانا شریعت الدین ترکی ومولانا معین الدین دولت آبادی ومولانا نجم الدین سمرقندی ومولانا قطب الدین مکی ومولانا احمد بخاری وعلمایان دیگر رحمۃ اللہ علیہم والغفران ہر یک باتفاق بریں آمدند واجازت فتوی کردند۔

لیکن یہ اثر ورسوخ کہ اکابر علمار اور مشائخ نے متفقہ طور پر آپ کو اپنا بزرگ اور بڑا مان لیا۔ اور شرعی نقطہ نظر سے آپ ہی کے فیصلے اور فتوے کو

[ل] سب درویشوں اور علمار نے اکٹھے ہو کر اس فقیر سے فرمایا۔ کہ ہم سب سے زیادہ بزرگ اور افضل آپ ہیں۔ اس اجتماع میں یہ حضرات شریک تھے۔

حرفِ آخر قرار دیا۔ظاہر ہے دو چار سال میں حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے اور بظاہر یہ بات صحیح ہے کہ چالیس سال تک آپ کے حلقۂ درس کی گرم بازاری نے دانشوروں اور علماء کو مجبور کر دیا تھا کہ آپ کو عظمت وقیادت کا تاج پہنائیں اور اپنی گردنیں آپ کی عزت وحرمت کے لئے خم کریں۔ پھر آپ کی یہ تاجپوشی اس زمانے کے بادشاہوں کی طرح چند روزہ نہیں تھی۔ بلکہ بیس سال تک آپ کے انفاس قدسیہ سے مسندِ افتاء آراستہ رہی۔ خود آپ کا ارشاد ہے۔

"بست سال فتویٰ دادم وسبقہ گفتم"۔

بیس سال کے بعد بھی کسی باہر کے حریف نے یہ مسند نہیں چھینی، بلکہ خود قلندر صاحب کی گیتی فطرت سے سندانِ عشق حملہ آور ہوا اور اس نے آبگینۂ علم کو پارہ پارہ کر دیا۔ پھر اہرمن شوق کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ علم کے تمام سفینوں کو آپ نے دریائے استغراق میں غرق کر دیا۔ آپ حکمنامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ:۔

"اس درویش کو چار علم بتمام وکمال عطا ہوئے۔ علمِ شریعت، علمِ طریقت، علمِ حقیقت اور علمِ معرفت"۔

دہلی کے جملہ فضلاء نے مل کر مجھ سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ماہ عطا کر دیا جائے کہ ہم متفرق کتابوں کے کچھ اسباق آپ سے پڑھ لیں۔ مگر مجھ پر جذبۂ شوق کا غلبہ ہوا۔ میں دہلی سے نکل کھڑا ہوا صحرا کی راہ لی۔ اول "وزیر آباد" پہونچا۔ وہاں دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا۔ رات وہیں گذاری جب صبح ہوئی تو جتنی کتابیں میرے پاس تھیں سب کو دریا میں ڈال دیا۔

دوہا:۔ پنڈت لکھیا باپ کر پوتھی مالی تور: سکھ رے انجھر میٹ کر من میں سائیں لوڑ

ترک فتوے وکتاب کردم ومشغول بزہد وطاعت گشتم۔

اس کے بعد آپ پانی پت تشریف لائے۔ پانی پت پہونچنے کی تاریخ ۱۴ر محرم الحرام تحریر فرمائی ہے۔ مگر سنہ تحریر نہیں ہے۔

حکمنامہ کیا ہے؟

یہاں بطور معترضہ حکمنامہ کا تعارف کرایا جاتا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں چند بار آیا ہے۔

حضرت مولانا القار اللہ صاحب نے "دیوان حضرت شاہ بوعلی قلندر" کا ایک قلمی نسخہ احقر کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے آخر میں یہ حکمنامہ درج ہے۔ جس کے کل ۵ صفحات ہیں۔ یہ گویا حضرت شاہ قلندر صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح ہے۔ پہلے اور دوسرے صفحہ کے چند اقتباسات سطور بالا میں پیش کیے گئے۔ کچھ اقتباسات آئندہ سطور میں پیش کیے جائیں گے۔ اب شانِ قلندری ملاحظہ فرمایئے۔ کہ اس مختصر کا بھی تقریباً ڈیڑھ صفحہ اشعار سے بھرا ہوا ہے جو ایک مغنی نے آپ کی فرمائش پر پڑھے ہیں۔ گویا خود آپ کی نظر میں اپنی سوانح کا یہ ایسا واقعہ ہے جس کو مختصر سے مختصر سوانح میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اب واقعہ ملاحظہ فرمایئے اور دلچسپی لیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ رمضان شریف کی ستائیسویں ۲۷ شب اور جمعہ کی رات تھی کہ شوقِ الٰہی نے ایک کیفیت پیدا کی۔ آپ نے اسی عالمِ کیف میں اپنے مخلص مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا۔

"کسے را بیار تا چند غزل در علم موسیقی بخواند تا وقت ما خوش وخرم شود۔"

ترجمہ:۔ (کسی کو بلالو تاکہ فنِ موسیقی کے ساتھ چند غزلیں سنادے جس سے ہمارا یہ وقت پُر فرحت و پُر نشاط ہو جائے۔)

مولانا نے دریافت فرمایا:۔ کس کو بلاؤں۔ آپ نے فرمایا۔

ابراہیم کے لڑکے کو بلالو۔ جس کا نام زکریا ہے اور شہید الشہیدی (؟)

کے روضہ کے قریب اس کا مکان ہے "۔

مولانا سراج الدین صاحب اس لڑکے کو لے آئے۔ اس کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اس نے دو غزلیں پڑھیں۔ پانچ شعر ایک غزل میں ہیں جس کا مطلع ہے۔

ساربان با اشتران مست در رفتار مست

میر مست و خواجہ مست و یار مست اغیار مست

پندرہ شعر دوسری غزل میں ہیں۔ یہ غزل خود حضرت قلندر صاحب کی ہے اس کا مطلع ہے۔

با صورت آدم نبرد سجدہ عزازیل

زاں مدعی آرد بتو در سجدۂ ما تبیل

اور آخری مقطع یہ ہے۔

در روئے تو دیدہ شرف اسرار عجائب

کز وے نتواں کرد حکایات بہ تمثیل

ہاں بوعلی از مدعیان ہیچ نہ رنجی

با صورت آدم نبرد سجدہ عزازیل

حضرت قلندر صاحب اتنے محظوظ ہوئے کہ آپ نے لڑکے کو قریب بلا کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

" بیٹا تم ہمارے ہو۔ لڑکوں بالوں کا ایک انبوہ تمہیں اللہ تعالیٰ بخشے گا۔ تمہارے گھوڑوں کا اصطبل (خیل خانہ) بہت بڑا ہو گا"۔

پھر آپ نے مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا۔

" جبہ و دستار را بیار تا من بریں پسر عطا کنم۔"

ترجمہ:۔ (جبہ و دستار لے آؤ تاکہ اس لڑکے کو دے دوں۔"

مولانا سراج الدین صاحب نے حکم کی تعمیل کی۔ جبہ و دستار لاکر پیش کر دیا
آپ نے یہ خلعت اس لڑکے کو عنایت فرمایا۔ اس کی برکت یہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ
میں لوگوں نے دیکھ لیا۔

"آں پسر در حضرت صمدیت مقبول شد۔"

ترجمہ:۔ (وہ لڑکا مقبول بارگاہ اور خدا رسیدہ بزرگ ہو گیا)

یہ تو حکمنامہ ہوا اب اس کی تاثیر ملاحظہ فرمایئے جو تاثیر علماء کرام نے "حزب البحر"
کی بیان کی ہے۔ تقریباً اسی قسم کی تاثیر اس حکمنامہ کی بھی تحریر کی گئی ہے۔ اور اسی
وجہ سے شیخ محمد عرف غلام لیسین نے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لئے تبرکاً و
تیمناً نقل کیا ہے۔

(بتاریخ نوزدہم ۱۲۳۶ھ شعبان المعظم (یوم جمعہ) بعہد والا سپہر
جاہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلف حضرت شاہ عالم عالی گوہر مغفور)۔
یعنی آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے۔ مگر "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"
ایک طرف شیخ محمد صاحب کا یہ حسنِ اعتقاد ہے۔ دوسری جانب ایک محقق کی تحقیق
ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت مولانا عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں۔
رسالہ دیگر در عوام الناس شہرت دارد کہ او را حکمنامہ شیخ شرف الدین
می گویند۔ ظاہر آنست کہ آں از مخترعات عوام است۔ واللہ اعلم

(اخبار الاخیار)

یعنی یہ حکمنامہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حضرت قلندر صاحب کی
طرف اس کا انتساب بھی غلط ہے۔ یہ محض عوام کی گھڑی ہوئی تحریر
ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

مشائخ اور مریدین ۔ مصنف شرف المناقب (مولانا محمد بن احمد بن عثمان)

کی رائے یہ ہے کہ آپ اگرچہ اپنے زمانہ کے متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضر رہے مگر درحقیقت آپ کی تربیت براہ راست، صدر نشین منصب ولایت جناب حضرت علی بن ابی طالبؓ کی رُوح مقدس سے ہوئی ہے۔ مولانا محمد صاحب فرماتے ہیں کہ "اگرچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے۔ کسی کا خیال ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین عاشق خدا (خلیفہ امام الدین ابدالی) سے بیعت تھے (جن کا مزار دہلی میں ہے) مگر

"آنچہ بہ فقیر تحقیق پیوستہ ہمیں ست کہ از روح مقدس حضرت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تربیت شدہ واز علوم اولین و آخرین بہرہ یاب گشتہ اند"

ترجمہ:۔ (اس فقیر کی تحقیق میں جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رُوح مقدس سے تربیت ہوئی۔ اور آپ کے اُن علوم سے جو اگلے پچھلے علوم پر حاوی تھے، حضرت قلندر صاحب فیض یاب ہوئے ہیں۔

مولانا موصوف نے اپنے اس دعوے کی تین دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول یہ کہ کسی کتاب یا رسالہ میں یہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آپ کسی سے بیعت ہوئے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

دوم مولانا شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نسبت ارادت او از یکے ازیں مشائخ مشہور نیست۔ بعضے گویند بخواجہ قطب الدین بختیار کاکی ارادت داشت۔ بعضے گویند شیخ

نظام الدین اولیاء، و ہیچ یکے ازیں رو بصحبت نرسیدہ است "

ترجمہ :- (اس زمانہ کے مشہور مشائخ میں سے کسی سے بھی اُن کو ارادت وبیعت کا تعلق نہیں ہے ۔بعض علمار کہتے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے ۔کسی کا خیال ہے کہ حضرت نظام الدین اولیار سے تعلق ارادت رکھتے تھے ۔ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے ۔

تیسری دلیل - شیخ کالہ کی ایک روایت ہے ۔ شیخ کالہ حضرت قلندر صاحب کے برادر زادے تھے وہ فرماتے ہیں ۔کہ شیخ عثمان جو حضرت قلندر کے مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت قلندر صاحب کے اُستاد مولانا سراج الدین صاحب مکّی سے دریافت کیا کہ آں عاشق الہٰی (قلندر صاحب) کس کے مرید تھے ۔مولانا سراج الدین صاحب نے برجستہ جواب دیا " امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے " اس شخص نے پھر عرض کیا ۔مشہور تو یہ ہے کہ شاہ شہاب الدینؒ سے مرید تھے ۔

مولانا سراج الدین نے جواب میں فرمایا :-

برادرِ من ! بیشک عوام کو اسی بیعت وارادت کا علم ہوتا ہے جو ظاہر میں کسی سے ہوتی ہے لیکن اصل ارادت وہ ہے جو روحانیت کے لحاظ سے ہو ۔جس سے کسی کی روحانیت کی تعمیر و تربیت ہو ۔اس کا ہر ایک کو علم نہیں ہوتا ۔اس کو وہی جانتے ہیں جو اس کے رازداں ہوتے ہیں ۔

پھر مولانا نے فرمایا :- میں نے خود شیخ شرف الدین صاحبؒ کی زبان سے بارہا سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے ۔

" مرا فیض روحانی از جناب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ رسیدہ است ۔ چنانچہ پرتو آفتاب بر دیوار می تابد و او منور می شود ۔ (شرف المناقب)

یعنی "جس طرح آفتاب کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آفتابِ فیض کی شعاعوں نے میری تربیت فرمائی ہے۔"

صاحب شرف المناقب کی رائے سے اس حد تک تو ہمیں بھی اتفاق ہے کہ حضرت قلندر صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت نہیں تھے۔ کیونکہ حکمنانہ کی تصریح کے بموجب حضرت قلندر صاحب چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ یعنی ۶۴۴ھ میں اور حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے گیارہ سال پہلے ۶۳۳ھ میں وفات پا چکے ہیں۔ لہذا بلاواسطہ حضرت قطب صاحب سے بیعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس تحقیق کی بنا پر شرف المناقب کا یہ ارشاد بھی صحیح نہیں ہے کہ:-

"گاہ گاہ آں عاشق الٰہی بخدمت خواجہ قطب الدین دہلوی می رفتند۔ و آنحضرت بر ایشاں توجہ والطاف می فرمودند۔ و در انجمن شوق و مجلس صحبت خواجہ صاحب موصوف حاضر می شدند۔"

ترجمہ:- یعنی کبھی کبھی قلندر صاحب حضرت قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور قطب صاحب خاص توجہ اور لطف و کرم فرماتے تھے۔ اور حضرت قطب صاحب کی انجمن شوق اور مجلس تلقین میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔"

بہرحال صاحب شرف المناقب کی رائے کے اتنے حصے سے ہمیں اتفاق ہے کہ آپ حضرت قطب صاحبؒ سے بلاواسطہ بیعت نہیں تھے لیکن اس سے ہمیں اتفاق نہیں کہ آپ کسی سے بھی بیعت نہیں تھے۔

صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ یہ درست ہے آپ نے اپنی زیر مطالعہ کتابوں میں سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا

ہو گا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے حضرت مولانا سراج الدین ملی کا مکالمہ نقل کر کے خود اپنی کتاب میں قلندر صاحب کے بیعت ہونے کی تصدیق فرمادی ہے۔ کیونکہ مولانا ملی نے اس سے انکار نہیں فرمایا کہ قلندر صاحب حضرت شاہ شہاب الدین صاحب سے بیعت نہیں تھے۔ آپ نے یہ فرمایا کہ تربیت آپ کی شاہ شہاب الدین نے نہیں فرمائی۔ بلکہ تربیت حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فیض روحانی سے ہوئی ہے۔ اس سے بیعت کی نفی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انھیں کے وطن عزیز "پانی پت" کے سوانح نگار شیخ اللہ دیا ابن شیخ عبدالرحیم۔ ابن شیخ پناہ حکیم چشتی عثمانی) اپنی مشہور تصنیف سیرت الاقطاب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ونسبت شجرہ وخلافت کہ بقطب الشاہدین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز مے پیوندد۔ بدیں طریق حضرت قطب ابدال مخدوم شیخ شرف الدین بو علی قلندر مرید وخلیفہ حضرت شیخ شہاب الدین عاشق خدا است وہو من شیخ امام الدین ابدال وہو من حضرت شیخ بدر الدین غزنوی وہو من قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہٗ العزیز رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ترجمہ:۔ آپ کا شجرہ بیعت وخلافت جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قلندر شیخ شہاب الدین کے خلیفہ ہیں جو 'عاشق خدا' کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ شہاب الدین شیخ امام الدین ابدال کے خلیفہ۔ شیخ امام الدین نے شیخ بدر الدین غزنوی سے خرقہ خلافت حاصل کیا اور شیخ بدر الدین حضرت قطب صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

صاحب شرف المناقب (محمد بن احمد بن عثمان) غالباً تیرہویں صدی ہجری کے مصنف ہیں اور سیر الاقطاب اس سے دو سو سال پہلے (درسنہ ہشت و ثلاثین و الف) ۱۰۳۸ھ (جہانگیر بادشاہ) کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ تعجب ہے صاحب شرف المناقب کے مطالعہ سے نہیں گذری۔ باقی رہا حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کا یہ ارشاد کہ "نسبت ارادت او بیکے ازیں مشائخ مشہور نیست" تو محدث صاحب نے اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت سے بیعت کی نفی کی ہے حضرت شیخ شہاب الدین صاحب اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت میں نہیں تھے۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت محدث صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" میں اُن کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت قلندر صاحب قاعدے کے مطابق حضرت شیخ شہاب الدین عاشق خدا سے بیعت تھے۔ البتہ فیض روحانی آپ کو سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہٗ سے حاصل ہوا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) اس کے علاوہ ایک اور روایت بھی ہے جس کو اعراسنامہ کے حوالہ سے حضرت مولانا عبد الحی صاحب نے نقل کیا ہے کہ آپ نے شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ حضرت شمس الدین تبریزی۔ حضرت شیخ قطب الدین البری کے خلیفہ تھے اور حضرت شیخ قطب الدین حضرت شیخ ضیاء الدین ابی النجیب عبد القاہر سہروردی کے خلیفہ تھے۔ اگر یہ روایت صحیح مانی جائے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ سلسلہ چشتیہ میں آپ نے حضرت شیخ شہاب الدین سے نسبت حاصل کی ہو اور سلسلہ سہروردیہ میں حضرت شیخ شمس الدین تبریزی سے۔ واللہ اعلم

مریدین اس سلسلہ میں پہلے "حکمنامہ" کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے ارشاد ہے۔

"میں مرید بھی کیا کرتا تھا اس درویش کے کچھ مرید سلاطین اور خواقین تھے جیسے سلطان جلال الدین سلطان علاء الدین، خضر خاں، آصف خاں، اور سیف خاں۔

اس کے بعد "حکمنامہ کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"جو شخص اس درویش (قلندر صاحب) کے پاس آتا تھا اپنی مرادیں کامیاب ہوجاتا تھا۔ چنانچہ میرے کچھ مرید ایسے ہوئے ہیں جو گرم تنور میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ کچھ مرید ایسے تھے جو آب رواں پر مصلےٰ بچھا لیا کرتے تھے اور وہ مصلےٰ تر نہیں ہوتا تھا۔"

اس کے بعد قلندر صاحب کا ارشاد حکمنامہ میں نقل کیا گیا ہے کہ پانچ چھ تاجدار بادشاہ اس درویش کے آستانہ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کیا کرتے تھے۔

آستانۂ قلندری پر بادشاہوں کی حاضری مُسلّم ہے۔ باقی جہاں تک تنور میں نماز پڑھنے اور آبِ رواں پر مصلےٰ بچھانے کا تعلق ہے تو اگرچہ ہمارا عقیدہ ہے۔ کہ "کرامات الاولیار حق" مگر یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیئے۔ کہ حضرت مجدد الف ثانی رح اور ان جیسے دوسرے اکابر اس طرح کی کرامتوں کو "مقبولیت" اور "تقرب الی اللہ" کا مدار قرار نہیں دیتے۔ بلکہ ان حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی کرامتیں بسا اوقات تقرب کے بجائے بُعد کا سبب بن جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر کسی شخص کو اس طرح کی کرامتوں پر ناز ہوگیا۔ تو یہ فخر و ناز خدا بینی کے بجائے خود بینی کے دام میں اُلجھا دیتا ہے۔

حضرات علمار کرام کے عقیدہ کے مطابق قرب اور مقبولیت عند اللہ کا مدار اتباع سنت ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جملہ مقربین کے سرتاج ہیں۔ آپ کے اخلاق کی تعریف خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور آپ کے کردار اور اسوۂ کو نشانِ مقبولیت بنایا گیا ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ نیز ارشاد ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ اس کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ کی یہ تحقیق بھی فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ "حکمنامہ از مخترعات عوام ست

بہرحال حضرت قلندر صاحب کے متعلق "حکمنامہ" کی شہادت یہ ہے کہ وہ مرید بھی کیا کرتے تھے۔ بظاہر "قیام دہلی" کے زمانہ میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب ہاتفِ جذب نے صحرا نوردی کی دعوت دی اور آپ نے وزیر آباد کے قریب دریائے جمن کے کنارے رات گذار کر صبح کو "سفینۂ علم" اور "اوراق دانش" کو غرقاب کیا۔ پھر آپ حدودِ پانی پت میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی ڈیڑھ ہزار نفوس آپ کے ساتھ تھے۔ جن کو آپ نے مفارقت کی تلخی چکھائی۔

"ترک فتوے و کتاب گرفتم و مشغول بزہد و طاعت شدم چہاردہم ماہ محرم بود که درحد پانی پت درآمدم۔ پانصد و ہزار نفر ہمراہ بودند گذرانیدم بعدازاں درخطہ پانی پت نزول خود کردم۔ (حکمنامہ)

ترجمہ:۔ فتویٰ لکھنا بھی چھوڑ دیا اور کتابوں کا مطالعہ بھی ترک کر دیا اور زہد و طاعت میں مشغول ہو گیا۔ محرم کی چودھویں کو پانی پت میں داخل ہوا۔ ڈیڑھ ہزار آدمی ساتھ تھے سب کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد پانی پت کے علاقہ میں فروکش ہو گیا۔

اب نہ پیری ہے نہ مریدی۔ جو کچھ ہے قلندری ہی قلندری ہے جس کی تفصیل (آگے آئے گی انشاء اللہ) مختصر یہ کہ۔

عشق اول، عشق آخر، عشق کُل
عشق شاخ و عشق نخل و عشق گُل

استغناء اور بے نیازی

بے نیازی یہی نہیں ہے کہ کتابوں کو دریا بُرد کر دیا۔ بلکہ اس سے پہلے ہزار دینار از خزانہ بیت المال کشیدہ در راہ خدا تعالیٰ صدقہ دادم۔ (حکمنامہ)

پھر اس کے بعد:۔

"پنج شش بادشاہان وتاجداران در آستانہ ایں درویش آمدہ آستاں بوسی می کردند۔ از کسے دانگے درمے قبول نمی کردم کہ مرا خزانۂ الٰہی موجود بود ہر کہ مے خواستم میدادم ونصیب خود مے بردند وایں خزانہ برابر خود مہیداشتم۔

ترجمہ:۔ پانچ چھ بادشاہ اور تاجدار اس فقیر کی چوکھٹ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کرتے تھے۔ میں کسی سے کبھی ایک ،حبہ یا ایک درہم بھی منظور نہیں کرتا تھا۔ کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کا خزانہ کافی ہے۔ جس کو جو چاہنا تھا دے دیتا تھا۔ ہر شخص اپنا حصہ مجھ سے لے جاتا تھا۔ میرا خزانہ جوں کا توں باقی رہتا تھا۔"

یہ خزانہ کیسا تھا؟ خزانہ تھا یا قلندرانہ تصور تھا۔ ہم تو سمجھتے ہیں سب سے بڑا خزانہ وہ ضمیر منیر تھا جو ہر ایک خزانہ سے مستغنی ہو چکا تھا۔ سرور کائنات فخر موجودات کا ارشاد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

خیر الغنا غنا القلب (سب سے بہتر دولت مندی قلب کا استغنا ہے)

اے کہ پُرسی چہ کسانیم وچہ سامان داریم
انچہ ہیچ نیرزو بجہاں آں داریم

ترجمہ:۔ تم پوچھتے ہو ہم کون ہیں؟ کیا سامان رکھتے ہیں۔ ہم وہ رکھتے ہیں کہ دنیا کی کوئی چیز اس کی قیمت کو نہیں پہونچتی۔

خود قلندر صاحب کے الفاظ میں اس حدیث کی تفسیر ملاحظہ ہو ارشاد ہے۔

زُہد وتقویٰ چیست اے مردِ فقیر!
لا طمع بودن زسلطان وامیر
گر بدست آید ترا گنج نقود
ور نداری ہمت عالی چہ سود

ترجمہ :۔ اے مردِ فقیر زُہد و تقویٰ کیا ہے؟ زُہد و تقویٰ یہ ہے کہ کسی بادشاہ یا دولتمند سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ اگر بیشمار سکّوں کا خزانہ تمہیں مل جائے، اگر تمہاری ہمت بلند نہیں ہے تو یہ دولتمندی بے فائدہ ہے۔

تصنیفات دیوان کا تذکرہ پہلے آچکا۔ مثنوی بو علی شاہ قلندر ایک مشہور مثنوی ہے۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں لکھی گئی جب بقول قلندر صاحب "ترک فتوے و کتاب گرفتیم"

چنانچہ پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے وہ اسی عشق کل کی غمازی کر رہا ہے جس کا نام قلندری ہے۔ ارشاد ہے۔

مرحبا اے بلبلِ باغِ کہن
از گُلِ رعنا بگو با ما سخن

ترجمہ :۔ اے پرانے باغ کی بلبل خوب آئی۔ اس گُلِ رعنا کی کچھ باتیں ہم سے کہو۔

پھر ارشاد ہے :۔

عشق بازی می کنم با او مدام
یافت آدم از طفیل عشق کام

ترجمہ :۔ میں ہمیشہ اس سے عشق بازی کرتا ہوں۔ عشق بازی وہ جوہر ہے کہ اسی کی بنیاد پر حضرت آدمؑ مقصد میں کامیاب ہوئے۔

(۳) حال ہی میں غزلوں اور مثنویوں کا ایک مجموعہ کتب خانہ یوسف احمد شاہ نے شائع کیا ہے۔ کلام قلندری اس کا نام ہے۔ اس میں مثنوی اور دیوان مذکور کے اشعار بھی ہیں اور ان کے علاوہ بھی تقریباً سترہ سو شعر ہیں۔ کل مجموعہ میں تقریباً چار ہزار شعر ہیں۔ ملنے کا پتہ :۔ مولانا محمد بشارت علی۔ روبروے تل گنبد سلطان شاہی حیدرآباد (دکن)

(۴) حکمنامہ کا نہ صرف تذکرہ بلکہ اس کے اقتباسات بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔
اس کو حکمنامہ شیخ شرف الدین بو علی قلندر کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔
کہ حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ دہلوی کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ۔

"از مخترعات عوام است"

البتہ حضرت مولانا دہلویؒ ایک مکتوبؒ کی تصدیق کرتے ہیں کہ:۔

"او را مکتوب ست بزبانِ عشق و محبت مشتمل بر معارف و حقائق توحید و ترک دنیا و طلب آخرت و محبت مولیٰ۔ جملہ آں بنام اختیار الدین می گویند"

ترجمہ:۔ آپ کا ایک مکتوب ہے۔ یہ مکتوب عشق و محبت کی زبان میں لکھا ہے۔ معارف و حقائق توحید، ترک دنیا، طلب آخرت اور محبت مولیٰ کے مضامین اس میں سمو دیئے گئے ہیں۔ اختیار الدین صاحب مکتوب الیہ ہیں جن کے نام یہ خط لکھا گیا ہے۔"

اللہ دیا صاحب سیر الاقطاب میں فرماتے ہیں:۔

"با اشعار آبدار و پُر اسرار صاحب دیوان ست و مکتوبات نادر و رنگین دارد۔"

بہرحال مکتوبات کا تو پتہ نہیں ۔ البتہ محدث صاحب دہلویؒ نے ایک مکتوب نقل فرمایا ہے۔ یہ مکتوب خود ایک چھوٹا سا رسالہ ہے۔ یہاں پورا مکتوب تو نقل نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے چند فقروں کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ آپ بھی کچھ اندازہ کرلیں کہ عشق و محبت کی زبان کیسی ہوتی ہے۔

عشق کب پیدا ہوسکتا ہے۔ عنایت خصوصی متوجہ ہو۔ جذبہ پیدا ہو اور انانیت ختم ہوجائے۔ "میں کچھ ہوں" یہ احساس فنا ہوجائے۔

اے برادر چوں عنایت در کار تو کنند و جذبہ در تو نہند، و ترا از توئی برہانند آنگاہ عشق در تو آید۔

مثنوی میں آپ کا ارشاد ہے :-

تا توئی کے یار گردد یار تو
چوں نباشی یار باشد یار تو
تو مباش اصلاً کمال این ست وبس
تو درو گم شو وصال این ست وبس

ترجمہ :- جب تک تو اپنی توئی اور اپنی شخصیت باقی رکھے ہوئے ہے ! یار کب یار ہو سکتا ہے - جب تم نہ رہو گے تب یار یار ہو سکتا ہے -

تم اپنی ہستی اور اپنی شخصیت کو ختم کر دو - قطعاً اپنے اوپر نظر نہ رکھو بس یہ ہی ہے کمال - تم بالکل اپنے آپ کو فنا کر دو صرف اسی کا نام کمال ہے تم محبوب میں گم ہو جاؤ - یہی ہے وصال اور بس -

اور ہاں جب عشق پیدا ہو جائے - جب ہی جلوۂ حُسن بھی نمودار ہوگا - جب یہ پہچان سکو گے "حُسن کیا ہے - تب ہی معشوق کو پہچان سکتے ہو - اور اسی وقت معشوق کے صحیح عاشق بن سکتے ہو اور جو امانت عاشق حقیقی نے معشوق کے سپرد کی ہے - اس پر عمل کر سکتے ہو -

اے برادر ! معشوق کو تمھاری ہی صورت میں پیدا کیا ہے - اور تمھارے زمرے میں مبعوث فرمایا ہے تاکہ صراط مستقیم کی دعوت دے -

اے برادر ! باری عزوجل نے بہشت و دوزخ پیدا کی - اور یہ فیصلہ کر دیا کہ دونوں کو بھر کروں گا - معشوق کو اس کے عاشقوں سمیت جنت میں پہنچاؤں گا - اور شیطان کو اس کے پیروؤں کے ساتھ دوزخ میں ڈالونگا !

اے برادر ! بہشت و دوزخ میں عاشق کے سوا کوئی نہیں - بہشت میں بھی عاشق ہی ہے - اور دوزخ میں بھی عاشق ہی ہے - یہ دونوں عاشق

کے حُسن سے پیدا ہوئی ہیں۔

فرق یہ ہے:۔

بہشت مقامِ وصال است با دوستاں
(بہشت وصال کی جگہ ہے)
دوزخ مقام فراق است بر دشمناں
(دوزخ دشمنوں کے لئے جائے فراق ہے)

فراق، کافروں اور منافقوں کے لئے اور وصال، عاشقان و محبانِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے۔

اس مکتوبِ گرامی کے بنیادی نکتے یہ ہیں کہ:۔

(۱) خود حضرت حق جل مجدہٗ عاشق حقیقی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

اے برادر! دل کی آنکھ کھولو اور خوب غور سے دیکھو۔ عاشق نے اپنے عشق سے تمھارے لئے کیسی کیسی چیزیں پیدا کیں اور کیسے کیسے حسین مناظر سے تمھاری نگاہوں کو تازگی اور دلوں کو فرحت بخشی۔ اپنے حُسن کا پَرتو ہر درخت پر ڈالا، طرح طرح کے میوے پیدا کئے۔ ہر میوے کا الگ مزا رکھا۔ اس درخت کو نہ اپنی خبر نہ اپنے پتوں کی خبر نہ اپنے پھل کی خبر۔ نیشکر کی رگ رگ میں تمھارے لئے شکر بھر دی۔ آہوئے ختن کے نافہ کو مشک سے بھرپور کر دیا۔ نیشکر کو خود اپنی شکر کی خبر نہیں، اسی طرح ہرن خود اپنے نافہ اور مشک سے ناواقف ہے۔ یہ سب اس کے عشق و محبت کی کرم فرمائی ہے۔

(۲) معشوق حقیقی محبوب رب العالمین خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا کہ ارشاد ہے:۔

اے برادر! معشوق را ہمہ بصورت تو آفریدہ اند رمیان شما فرستادہ اند،
تا دعوت کنند براہ راست۔

ترجمہ :۔ اے برادر! معشوق (حقیقی) کو تیری ہی صورت میں (انسانی صورت میں)
پیدا کیا، تمھارے درمیان میں بھیجا تاکہ سیدھے راستہ کی دعوت دے۔

(۳) انسان کو حکم ہے کہ جہاں تک اس کا اختیار اور اس کی قدرت ہے۔
اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی خصلتیں اختیار کرے۔ وہ عاشق ہے تو انسان کو
بھی عاشق ہونا چاہیئے اور جس طرح ہر مخلوق عشقِ خالق کا آئینہ ہے۔ اسی طرح ہر
مخلوق انسان کی بھی معشوق ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

اے برادر عاشق شو، ہر دو عالم را حسن معشوق داں وخود را حسن معشوق
خواں۔ عاشق از خود ملک وجود تو ساخت تا جمالِ حسن در آئینہ تو بہ بیند
وترا محرم اسرار بداند "الانسان سری" در شان تو آمد۔ عاشق شو حُسن
را دائم ببیں وبشناس دنیا را وعقبیٰ را وبداں کہ عقبیٰ ملک محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) است ودنیا ملکِ شیطان ہر دو را دریاب کہ برائے چہ آفریدہ اند
وچہ خواہند کرد۔ (اخبار الاخیار ص ۱۳۰)

ترجمہ :۔ اے بھائی عاشق ہو جا۔ دونوں جہانوں کو معشوق کا حسن سمجھو،
خود کو بھی معشوق کا حُسن سمجھو۔ عاشق نے خود بخود تمھارے وجود کی
مملکت کو پیدا کیا۔ تاکہ تیرے آئینہ میں اپنے حُسن کا جمال دیکھے اور تجھے
محرم اسرار قرار دے "انسان میرا ایک راز ہے" تیری شان میں فرمایا۔
بس عاشق بن جاؤ۔ حُسن کو دائمی اور ابدی سمجھو۔ دنیا اور آخرت کا فرق سمجھو
اور یہ بھی یاد رکھو کہ "آخرت" حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مملکت
ہے اور "دنیا" شیطان کی مملکت ہے۔ دونوں پر غور کرو۔ اُن کو سمجھو۔

اور یہ بھی غور کرو کہ کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور وہ کیا چاہتے ہیں۔

شریعت:۔ یعنی قرآن وحدیث کی زبان میں اس مضمون کی تعبیر یہ ہے۔
اللہ تعالیٰ ارحم الرحمین ہے۔ پوری کائنات میں مرکز رحمت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ جن کے متعلق ارشاد ہے۔ وما ارسلناک الا رحمۃ اللعالمین
اس کائنات کے ذرہ ذرہ میں جو حُسن وخوبی ہے وہ تقاضائے رحمت ہے۔ خود اس کائنات کا وجود پرتو رحمت ہے۔

پس یہ بھی درست ہے کہ اگر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا نہ کیا ہوتا تو کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ساری مخلوق اپنے رب اور خالق سے وہی تعلق رکھتی ہے جو عیال کو اپنے سرپرست اور مربی سے ہوتا ہے۔ اس بنا پر انسان خصوصاً وہ انسان جو رحمت للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہونا چاہیئے کہ وہ سراسر رحمت ہو۔ ہر انسان کے لئے پیکر رحمت ہو۔ ہر مخلوق کے لئے مجسمۂ رحمت ہو۔ فاحبھم الی اللہ احسنھم الی خلقہٖ
(اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم)

اصحابِ تصنیف اور اربابِ درس کی توجہ منطق اور فلسفہ کی طرف رہی ہے۔
ان کی تصنیفی صلاحیتیں زیادہ تر اسی میدان میں صرف ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایک ایک ورقہ رسالہ "شمشیہ" کی شروحات سینکڑوں صفحات میں لکھدی گئیں۔ اگر عشق ومحبت کے اس آتشکدہ کی طرف بھی اربابِ تصنیف توجہ کرتے تو حضرت قلندر صاحب کے اس مکتوب کی شرح سینکڑوں صفحات میں لکھی جاسکتی تھی۔
مگر جہاں کا پورب اور پچھم ہی پلٹا ہوا ہو، جہاں کی دنیا نرالی ہو، جہاں ترک و فنا کو سب سے پہلی منزل قرار دیا جاتا ہو۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر

در طریق عشق اول منزل است

جہاں قاتل کو بد دعاؤں کی بجائے دعائیں دی جاتی ہوں ؎

آں کشتہ، ہیچ حق محبت ادا نہ کرد

کز بہر دست و بازو قاتل دعا نہ کرد

ایسے مقام پر قلم دوات لے کر کوئی کیا بیٹھے گا۔ اور کہاں سے کاغذ لائے گا کہ کتاب عشق کی تفسیر لکھے۔

در رہ منزل جاناں کہ خطرہاست بجان

شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

بہر حال اس کو آپ مکتوب کہئے یا مقالہ یا دو ورقہ کتابچہ۔ اس کی آخری سطریں یہ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سے سبق لینے کی توفیق ہو۔ اور کاش قلندر صاحب کے نام پر جان دینے والے جذبۂ قلندری کو پہچاننے اور اس کے لئے قربان ہونے کی بھی تمنا کریں۔ خاتمہ مکتوب یہ ہے۔

" اے برادر، ہیچ نمی دانم کہ چہ می گویم و از من چہ می آید و چہ می گویاند۔ زبان در قبضۂ قدرت خداست۔ اگر عنایت در کار تو می شود از تو آں چیز می گویاند۔ کہ پسندیدہ ہر دو جہانش سازد۔ اے برادر ایں قدر معلوم ست کہ بخواست خود پیدا کرد و بخواست خود می دارد۔ یفعل اللّٰہ مایشاء و یحکم ما یرید۔ انچہ خواست کرد۔ وانچہ خواہد می کند۔ کسے را در خواست او کارے نیست۔ (اخبار الاخیار)

ترجمہ:۔ اے برادر کچھ خبر نہیں، کیا کہہ رہا ہوں۔ "میں" کیا ہوں۔ مجھ سے کیا بن سکتا ہے۔ اور میری کیا حقیقت کہ کچھ کہہ سکوں۔ زبان اللہ تعالیٰ کے قبضہ

قدرت میں ہے ۔ اگر عنایت خداوندی شاملِ حال ہو تو تم سے ایسی بات کہلوادے جو دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں پسندیدہ ہو۔ اے برادر اتنی بات معلوم ہے کہ خود اس نے چاہا تو پیدا کر دیا۔ خود وہ چاہ رہا ہے تو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے۔ اور جس بات کا چاہے فیصلہ کر دیتا ہے جو اس نے چاہا کر دیا۔ جو چاہے گا کر دے گا۔ اُس کی خواست، اس کی چاہ، اس کے ارادہ اور منشا میں کسی کو دخل نہیں ہے۔

ایک بنیادی فرق

یہ باتیں ہم بھی کہتے ہیں، کہہ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہہ سکتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہمارا قول محض قول ہوتا ہے جو زبان اور حلق کا عمل ہوتا ہے۔ دل کی آواز نہیں ہوتی۔ زبان پر عشق و محبت کے الفاظ اور دل ناآشنا عشق، ہمدردیٔ خلقِ خدا کے نعرے سے حلق مجروح، مگر قلب درد سے بے بہرہ۔

اور جو سچا عاشق ہوتا ہے۔ اس کا قول صرف قول نہیں ہوتا، بلکہ حال ہوتا ہے۔ ایسا حال جس میں وہ خود گم رہتا ہے۔ اس کا نعرہ قلب مجروح کی ٹیس ہوتا ہے۔ دل کی صدا بلکہ دلِ نالاں کا گریہ ہوتا ہے۔

غور کرو، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ ہونے والا جب سراسر رحمت (یا قلندرانہ الفاظ میں) سراسر عشق ہو جائے تو خدا کی کسی بھی مخلوق سے اس کو نفرت کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے یہاں تو محبت ہی محبت ہوگی۔ دیر و حرم کا فرق اپنی جگہ۔ مگر جس کے یہاں نفرت کی جنس ہی ختم ہو گئی ہو وہ نفرت کہاں سے لائے۔ ہم محبت سے تہی دامن ہیں تو ہمارے یہاں محبت کا نام نہیں۔ عاشقانِ مصطفےٰ اور محبانِ خدا، نفرت سے تہی دامن ہیں تو ان کے یہاں نفرت کا نام نہیں ہوتا۔ ٥

کفر ست در شریعت ما کینہ داشتن

آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

ترجمہ :۔ ہماری شریعت میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے۔ ہمارا آئین ہے سینہ کو آئینہ کی طرح صاف رکھنا۔

قلندروں کی زبان میں یہ مفہوم اس طرح ادا کیا جاتا ہے :۔

عاشق از ایمان خرابست وہم از کفر

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

ترجمہ :۔ عاشق کا ایمان بھی خراب اور کفر بھی خراب، عاشق پروانہ ہوتا ہے اور پروانہ مسجد اور مندر کی شمع میں فرق کرنا نہیں جانتا۔

جب ان کو کسی سے نفرت نہیں، تو ان سے کسی کو نفرت کیوں ہو۔ کہا جاتا ہے کہ انسان تو انسان وحشی جانوروں کو بھی حضرت قلندر صاحب سے اُنسیت تھی۔ ہرن اور چیتل جو انسان کے سایہ سے بھی بھاگتے ہیں حضرت قلندر صاحب کے آس پاس اس طرح پھرتے تھے جیسے گھر کے پالتو جانور، اور جس طرح دہلی کے بادشاہ آپ کے آستانے پر حاضر ہوتے تھے جنگل کے بادشاہ (شیران شکاری) بھی آپ کی قدم بوسی کیا کرتے تھے۔ اس پر ایک افسانہ بھی بنا لیا گیا۔

افسانہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت قلندر صاحب شمال کے پہاڑ پر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک جوگی صاحب تھے۔ جوگی نے قلندر صاحب کو دیکھا تو حیرت سے کہا۔ آپ یہاں کیسے؟ یہ جگہ تو شیروں اور درندہ جانوروں کی ہے۔ یہاں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ قلندر صاحب نے جوگی سے کہا۔ آپ یہاں کیسے زندہ سلامت ہیں۔ جوگی نے جواب دیا۔ مجھے تو اُڑنے کی طاقت حاصل ہے۔ جیسے ہی کوئی شیر اس طرف آتا ہے میں اُڑ کر آسمان پر پہونچ جاتا ہوں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک

شیر ببر آپہونچا۔ جوگی صاحب فوراً آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ حضرت قلندر صاحب وہیں تشریف فرما رہے۔ مگر شیر قلندر صاحب پر حملہ تو کیا کرتا سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔

یہ تو قلندر صاحب کی صورت ہوئی۔ اِدھر جوگی صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ اُڑ کر آسمان پر تو پہونچ گئے۔ مگر جہاں جاتے اپنے ساتھ ساتھ قلندر کو بھی دیکھتے کہ قلندر صاحب اور شیروں کا غول ان کے ہمراہ ہے۔ انتہا یہ کہ جوگی صاحب تھک کر اپنی جگہ واپس ہوئے تو دیکھا قلندر صاحب اطمینان سے ایک چٹان پر بیٹھے ہیں۔ اور شیر ان کے سامنے اس طرح بیٹھا ہے کہ جیسے یہ مرید یا شاگرد رشید ہو۔ قلندر صاحب نے جوگی کو دیکھا تو مسکرا کر فرمایا۔ سادھو صاحب یہ عجیب مہمان داری ہے خود آسمان پر اُڑ گئے اور اپنے مہمانوں کو شیروں کے حوالے کر گئے۔ بہرحال قلندر صاحب کی اس عجیب و غریب کرامت نے جوگی کو یہاں تک متاثر کیا کہ وہ قلندر صاحب کے قدموں پر گر گیا کہ آپ ایسے خدا رسیدہ اور پہونچے ہوئے بزرگ ہیں کہ میرے لئے آپ کی کفش برداری اور خدمت گذاری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ آپ کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ صاحب شرف المناقب نے اس قصہ کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے۔ اس پہاڑ میں حضرت قلندر صاحب کے بیٹھنے کی جگہ اور اس جوگی کی قبر آج تک موجود ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے۔

بہرحال یہ کوہ شمال کون سا پہاڑ ہے اور وہاں یہ قبر ہے یا نہیں۔ اس کی حقیقت تک تو ہم جیسے کوتاہ بینوں کی نظر تفتیش نہیں پہونچ سکتی۔ مگر جس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ محبت کے ان دیوتاؤں کی نظر محبت کا یہ اثر تھا کہ ہر چیز ان سے محبت کرنے لگتی تھی۔ زبانِ شریعت میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے۔ من کان للہ کان اللہ لہٗ۔ جو اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

قلندری اور شانِ قلندری

عشق و محبت اور جذب و فنا کی بات یہاں تک پہنچی تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قلندری کے متعلق بھی کچھ باتیں یہیں کہہ دی جائیں۔

قلندر کون ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟ قلندری کیا ہے؟ یہ تمام باتیں تفصیل طلب ہیں۔ مگر تفصیل کون کرے۔؟

قلندری کی حقیقت وہی بیان کر سکتا ہے جو خود قلندر ہو یا مقام قلندری کا تجربہ کر کے آگے بڑھ چکا ہو" قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔"

مگر عجب تماشا یہ ہے کہ جو اس مرتبہ کے جاننے والے ہیں وہ زبانوں پر تالے ڈال لیتے ہیں" آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد۔" یعنی جس کو کچھ پتہ چل گیا وہ خود لاپتہ ہو گیا۔ کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں چلا۔

اسے خود غرضی کہئے یا بے غرضی، کہ جب پہونچ جاتا ہے۔ وہ زبان سے تو کیا بتاتا۔ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یا اُسے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ پلٹ کر دیکھ سکے۔

حضرت قلندر صاحب کے معاصر اور ہمنام یعنی شیخ شرف الدین مصلح عرف سعدی شیرازی (متوفی ۶۹۱ھ) ان کی طرف سے یہ معذرت پیش فرماتے ہیں۔

عاشقاں کشتگانِ معشوقند　　　بر نیاید ز کشتگان آواز

ترجمہ:۔ عاشق معشوق کے کشتہ اور قتل کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کشتہ اور مقتول کی آواز نہیں آیا کرتی۔

اور اس کا فلسفہ یہ بیان فرماتے ہیں۔

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

کاں سوختہ جاں را جاں شد و آواز نیامد

ترجمہ :۔ اے مرغِ سحر تو چہک کر یا چیخ کر عشق کا اظہار کرتا ہے یہ کمال کی بات نہیں،
تجھے چاہیئے کہ پروانہ سے عشق کرنا سیکھے۔ دیکھو۔ سوختہ جان پروانہ کی جان
جل جاتی ہے مگر آواز نہیں نکلتی۔

اور اس سے بھی زیادہ پُرلطف بات یہ کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے یا کہتا ہے
اس کے متعلق فتویٰ یہ ہوتا ہے۔

ایں مدعیان در طلبش بے خبر انند

ترجمہ :۔ یہ ڈینگیں مارنے والے بے خبر ہیں۔

اب ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو جب باخبروں کا فتویٰ یہ ہو کہ یہ بے خبر ہے تو
ہمارے کہنے کا اعتبار کیا۔ اور ایسی بے سند بات پر کون بھروسہ کرسکتا ہے۔
بہرحال حقیقت کی نقاب کشائی تو ناممکن ہے۔ البتہ کچھ پتے کی باتیں کہی جاسکتی
ہیں۔ خدا کرے وہ صحیح ہوں۔ اور انشاء اللہ صحیح ہوں گی۔ کیونکہ قلندروں نے
اگرچہ کچھ نہیں بنایا مگر اس نے سب کچھ بنا دیا ہے جس کے نام پر قلندر صاحبان
قلندری کرتے ہیں۔ اسی کی بنائی ہوئی باتوں میں سے کچھ باتیں یہاں لکھی جارہی ہیں

لفظ قلندر کے معنیٰ

مگر اس سے پہلے یہ معذرت بھی ضروری ہے۔ کہ
اہلِ لغت نے اسم "قلندر" پر بڑا ظلم کیا ہے۔
انتہا یہ کہ صاحب غیاث اللغات نے تو یہ لکھدیا کہ قلندر "کندۂ ناتراش" کو
کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "بعض گویند اصل کلندر بود کندہ و ناتراشیدہ و بعضے
اصلش غلندر گفتہ۔

اسی طرح مدعیان تصوف اور بقول حضرت شیخ سعدیؒ "مدعیان بے خبر"
نے قلندر کی ایسی تصویر بنائی جو بھیانک ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک گھناؤنی
بھی ہے۔ جس میں نہ تہذیب و سلیقہ ہے۔ نہ شرم و حیا۔ گو یا رند مشرب بدمست۔ (معاذ اللہ)

مگر واقعہ یہ ہے کہ قلندری تہذیب و شائستگی، علم و معرفت، بلکہ توحید و تفرید کی وہ آخری حد ہے جہاں انسان خود محو ہو جاتا ہے۔ سمندر کی موجیں اس کو باہر نہیں پھینکتیں۔ بلکہ خود اپنے اندر گم کر لیتی ہیں۔

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف

دلے کسے کہ بحسن او گرفتار است

اب آیئے۔ اپنی زبان میں کسی قدر تفصیل سے اس کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔

توحید کے معنی عام طور پر یہی کئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ذو الجلال کو بلا شرکت غیرے "واحد" ماننا بیشک توحید کے یہی معنی ہیں۔ مگر یہ لغت عربی یا عام اصطلاح کے لحاظ سے ہیں۔ اہل معرفت اس کو "عوام کی توحید" کہتے ہیں۔

خواص کی توحید صرف "مان لینے" پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "مان لینے" کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

یعنی جب یہ مان لیا کہ "اللہ تعالیٰ ایک" ہے وہی سب کا رازق و خالق ہے، وہی نفع نقصان پہونچانے والا ہے؛ وہی مشکلات کو حل کرتا ہے۔ وہی بیماروں کو شفا بخشتا ہے، وہی بے چاروں کا چارۂ کار ہے اور وہی ناکاروں کا کارساز ہے۔ وہی قادر مطلق ہے اور جو کچھ ہے اسی کے حکم اور اس کے علم و ارادہ سے ہے۔ تو اب لازم ہے کہ تمام امیدوں اور آرزوں کا تعلق اسی سے ہو۔ بیم و رجا جو کچھ ہو اسی سے ہو، نہ کبھی کوئی طمع قدم میں لغزش پیدا کرے۔ اور نہ کسی کا خوف و ہراس اس کے قلب پُرسکون کو مضطرب اور بے چین بنائے۔ مختصر یہ کہ جہاں تک کسی بھی نفع یا نقصان کا تعلق ہے۔ تقاضائے توحید یہ ہے کہ اس کو صرف ذاتِ حق "جل مجدہٗ" سے وابستہ کرے۔ نہ کسی غیر سے توقع سود رکھے نہ خوف زیاں۔

لیکن عشاق کی توحید اس سے بھی آگے ہے وہ سود و زیاں کی اضافتوں

اور نفع و نقصان کی نسبتوں تک محدود نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف ان افعال و صفات کا مرکز ایک "ذاتِ حق" کو مان لیں۔ بلکہ وہ خود عاشق بیچارہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی انانیت، اپنی شخصیت اور اپنی ہستی کو قربان گاہِ عشق پر قربان کر دے۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار باید کرد
یا سر برضار دوست می باید داد
یا قطع نظر از یار می باید کرد

یہاں صرف اپنی تمنا اور آرزو ہی قربان نہیں کی جاتی۔ صرف یہی مطالبہ نہیں ہوتا۔ کہ عاشق مرضی محبوب کو اپنی "رضا" بنا لے۔ بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ عاشق اپنی "انانیت" ختم کر دے۔ اپنی ہستی کا تصور یک قلم محو کر دے۔

تو مباش اصلا کمال اینست و بس
تو در دگم شو وصال اینست و بس

(قلندر صاحب)

اگر عاشق کے دل و دماغ میں "میں" کا تصور باقی ہے تو وہ عاشق صادق نہیں۔ فریب خوردہ عشق ہے۔

چو نمانی باخدا یابی وصال
خویش را گم ساز اے صاحب جمال
تا توئی کے یار گردد، یار تو
چوں نباشی، یار گردد، یار تو

(قلندر صاحب)

عاشق اور "میں" دو متضاد چیزیں ہیں۔ جب تک میں یا انا "باقی" ہے شرک موجود ہے۔ تقاضا توحید یہ ہے کہ "میں" اور "انا" کا تصور بھی ختم ہو۔ جہاں تک ہست کا تعلق ہے صرف ایک سے ہے۔ اور وہ' وہ ہے جو فی الواقع ہست ہے۔ جو واحد حقیقی ہے۔ جو "احد" ہے۔ جو "صمد" جو "لم یلد ولم یولد" ہے۔ جب سب کچھ وہی ہے۔ تو "انا" یا "میں" کے کیا معنی۔ اب اگر کوئی لفظ بامعنی ہے تو صرف ایک لفظ ہے یعنی "ہمہ اوست"

حضرت قلندر صاحب فرماتے ہیں:۔

ہر کہ شد در بحر عرفان آشنا
ذرّہ ذرّہ قطرہ داند از خدا
آبِ دریا چوں زند موجِ دگر
در حقیقت آب باشد جلوہ گر
نفس آب و چوں حباب ست جسم تو
آب چوں گردی نماند جسم تو
چوں الف در لام می گردد نہاں
خویش را گم ساز تا گردد عیاں
گشت واصل چوں بدریا آب جو
آب جو را باز از دریا مجو
تا توئی کے یار گردد یار تو
چوں نباشی یار باشد یار تو
مولوی فرمود در نظم ایں بیاں
بر تو گردد روشن اسرارِ نہاں

تو مباش اصلا کمال این ست وبس
تو درو گم شو وصال این ست وبس
یار را می بیں تو در ہر آئینہ
سوز و ساز اوست در ہر ظنطنہ
ہر چہ بینی در حقیقت جملہ اوست
شمع و گل، پروانہ بلبل ہم ازوست

آپ نے استغراق، محویت، سکر، ہیم جیسے الفاظ صوفیا کی کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔ اُردو کے ایک شاعر نے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے!
مجھے یہ فرصت کہاں کہ ہوں کیا ہیں؟

یہ گویا قلندری کی تفسیر ہے۔ مگر کچھ ظرف کا بھی فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق، مجذوب اور سالک، قلندر اور "عارف" میں امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

قلندر اور سالک میں فرق

بلاشبک "انانیت" ایک سالک اور شیخ طریقت کی بھی فنا ہوتی ہے۔ سالکین کے سرتاج انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ان کے اندر انانیت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ غور فرمایئے۔ ایک طرف عرش معلّٰی سے روح الامین "چلہ گاہ حرا" میں جلوہ افروز ہو کر رب العرش کا آخری اور مکمل ترین پیغام پہونچا رہے ہیں۔ "اقرأ باسم ربک الذی خلق۔" اور دوسری طرف انانیت" زعم من" اور تصور" میں" کے فنا اور ختم ہو جانے کی یہ شان ہے کہ اس رسول امینؐ کا قلب مبارک لرز رہا ہے اور نہ صرف قلب لرز رہا ہے بلکہ دل کی دھڑکن سے پورا بدن لرز رہا ہے کہ یہ بار امانت کس طرح برداشت ہو سکے گا۔ یعنی قلندروں کی زبان میں گویا قلبِ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم "انا" اور "میں" کو تلاش کر رہا ہے کہ وہ ہے کہاں۔ وہ تو ہیچ در ہیچ "ہے۔ وہ تو فنا رمحض ہے۔ وہ بار بردار کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک طرف رب السمٰوات والارض کی جانب سے یہ ناز برداری اور یہ لطف وعنایت کہ عرش و کرسی کی سیر کرائی جا رہی ہے۔ اور ان مقامات پر پہونچایا جا رہا ہے کہ اسرار ملکوتی کا سب سے بڑا امانت دار "جبرئیل امین" بھی کہہ رہا ہے۔

اگر یک سر موے بالا بپرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

اور دوسری جانب "زعم انا" کے فنا کا یہ عالم ہے کہ اُمت کے کمزور دل اور گنہگاروں سے بھی فرمائش کی جاتی ہے کہ ہر ایک اذان کے بعد دعا کرو۔ وابعثہ مقاماً محمودا۔ خداوندا ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مقامِ محمود پر فائز فرما۔ بقول شخصے :۔

در ہر پیرزن می زد پیمبرؐ
کہ اے زن در دعایم یاد آور

ترجمہ :۔ ہر بڑھیا کے دروازے پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دستک دیکر فرمایا کرتے تھے کہ بڑی بی مجھے دعا میں یاد رکھنا۔

سیرت مبارکہ میں اس طرح کی بیشمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ جن کی شہادت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی "انانیت" نہ صرف فنا ہوتی ہے بلکہ اس فنا میں ان کا مرتبہ اتنا ہی بلند ہوتا ہے جتنا منصب نبوت کا۔ لیکن اس فنا کے ساتھ ان میں بقا کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ مگر یہ بقا اپنے لئے نہیں بلکہ رضائے مولیٰ کے لئے یعنی جہاں تک خود ان کی اپنی رضا اپنی خواہش اور اپنی چاہ کا تعلق ہے وہ قطعاً فنا ہوتی ہے۔ خود قرآن حکیم کی شہادت ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ۔۔

دان کی کوئی بات خود ان کی چاہ پر نہیں ہوتی، لیکن اس فنا میں یہ بدمستی نہیں ہوتی کہ رضا محبوب کی بھی خبر نہ رہے۔ اور اس طرح سرگشتہ و حیران ہوجائے کہ بقول نواب ملتفت خاں۔ ؎

بخواب دیدہ ام آں طرّۂ پریشاں را
تمام عمر دگر خواب من پریشاں ست

بلکہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبع سالکین کرام جس طرح خود اپنی رضا اور اپنی چاہ اور پسند سے فانی ہوتے ہیں وہ اتنے ہی رضا مولیٰ سے باخبر اور اس کی تکمیل کے لئے کمربستہ اور سربکف رہتے ہیں۔ یعنی فناء اپنی ذات اور ہستی سے اور بقاء "رضا حق اور منشاء ربانی" کے لئے یہ حضرات مرضیٔ مولیٰ کے لئے ایسے چسپت اور اس طرح باخبر رہتے ہیں کہ یہ تصور بھی مشکل ہوتا ہے کہ ان کے اندر جذب و فنا بھی کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ جذب و فنا تو درکنار انھیں عشق و محبت سے بھی سروکار نہیں ہے۔

یہ شان بلند ترین شان ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہوتی ہے۔ اور ان کے طفیل میں اُمت کے ان خوش نصیبوں کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے۔ جن کو سالک کہا جاتا ہے۔ ان کی تلقین اور نصیحت یہ ہوتی ہے۔

از درون شو آشنا، وز بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش، کمتر بود اندر جہاں

اس کیفیت کی مختصر تعبیر یہ ہے۔ "دست بکار دل بیار"

قلندری اور پابندیٔ شریعت

سمجھا یہ جاتا ہے کہ قلندر اور مجذوب کو شریعت سے تعلق نہیں رہتا۔ مگر کیوں؟

عام خیال یہ ہے کہ اس درجہ پر پہونچ جاتے ہیں۔ تو خود صاحبِ شریعت یعنی

اللہ رب العزت ان سے کہہ دیتا ہے کہ رکوع و سجود تو ظاہری باتیں ہیں۔ اب جب یہ بات ہوگئی ہے کہ "من تو شدم تو من شدی" تو اب رکوع و سجدہ کیسا ؟ کس کے لئے اور کس جانب کو ؟ چنانچہ یہی حکمنامہ جس کے اقتباسات بار بار پیش کئے جا چکے ہیں۔ اسی مکالمہ میں خود حضرت قلندر صاحب کی طرف منسوب کرکے تحریر کیا گیا ہے۔ لفظی ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"مفتی اور حاکم اور سات درویشوں نے جو حافظ تھے۔ اس درویش سے (قلندر صاحب سے) ملاقات کی۔ محرم کی بیسویں تھی، صبح کا وقت، جمعہ کا دن، ان حضرات نے تکبیر کہتے ہوئے نماز کی اذان دی اور نمازیں شروع کر دیں۔ مولانا سراج الدین رکوعی نے اس درویش سے (قلندر صاحب سے) فرمایا۔ صبح صادق ہوگئی، سنتوں کا وقت ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ تکبیر پڑھیں تاکہ میں فرض ادا کرلوں۔ جب جماعت ہو چکی لوگ فرض صبح سے فارغ ہو چکے تو یہ سب علماء و فضلاء اور درویش جو نمازیں شریک تھے۔ اس درویش کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور سب نے مل کر مجھ سے فرمایا۔ مخدوم محترم! ہمیں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ جناب والا نے صبح کی سنتیں کیوں نہیں پڑھیں ؟ میں نے عرض کیا۔ خواجۂ کائنات، سرور موجودات، رحمت عالمیاں، صفوت آدمیاں، وتمہ دور زماں۔ احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس درویش کے متعلق یہ ہے کہ :۔

"اے شرف ہم نے اپنی سنتیں تم کو بخش دیں"۔

قلندر صاحبؒ فرماتے ہیں :" اس کے بعد چالیس سال تک میں صرف فرض نماز پڑھتا رہا کہ حضرت ذوالجلال کا فرمان اس درویش کے پاس پہونچا کہ :۔

"اے درویش تو از آں مائی و من از آں تو فریضۂ خود بتو بخشیدم"۔

ترجمہ (اے درویش اس بنا پر کہ تو ہمارا ہے اور ہم تیرے ہیں تو ہم نے اپنا فرض بھی

تجھ کو بخش دیا۔)

میں نے فوراً سجدۂ شکر ادا کیا۔

جب محدث دہلوی (حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحبؒ) کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مکالمہ "ایک اختراع" ہے تو اس روایت کو ثبوت میں تو نہیں پیش کیا جا سکتا۔

مگر اس سے عام خیالات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ قلندر کے متعلق تعلیم یافتہ لوگوں کے بھی خیال کیا ہوا کرتے تھے۔

مغل بادشاہوں کے دور میں اس طرح کے خیالات ایک طرح کا فیشن بن گئے تھے۔ یہاں تک کہ آزاد منش فقیر اسی کیفیت کو "مقصود اصلی" قرار دینے لگے تھے۔ شاہزادہ داراشکوہ کے پیر "ملاشاہ بدخشی" کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کی تفسیر کرتے ہوئے نماز ہی معاف کر دی تھی۔ آپ کی تفسیر کے الفاظ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"اے کسانیکہ ایمان حقیقی آوردہ اید نزدیک نماز نشوید درحالت سکر و مستی مقرر سکر حالت بلند تر ست از نماز گذاران۔ اگر مستی مجازی ست قرب نماز ممنوع ست تا نماز ملوث نشود۔ دریں صورت عزت نماز ست۔ واگر سکر حقیقی ست بازہم قرب نماز ممنوع ست۔ دریں صورت عزت سکر ست۔ مصلی نماند نماز کے خواند (حسنات العارفین بحوالہ شاندار ماضی ج ۱)

ترجمہ:۔ (اے لوگو! جو حقیقی ایمان رکھتے ہو۔ سکر و مستی کی حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ۔ بیشک حالتِ سکر نمازیوں کی حالت سے بہت بلند ہے۔ مستی اگر مجازی ہے یعنی نشہ سے بے ہوشی ہوگئی ہے تب بھی نماز کے پاس جانا ممنوع ہے۔ اس صورت میں نماز کی عزت و عظمت ہے تاکہ نماز ملوث اور آلودہ نہ ہو۔ اور اگر سکر حقیقی ہے یعنی عشق مولیٰ میں وارفتگی ہے۔ تب بھی قرب نماز ممنوع ہے۔ اس

صورت میں اس سکر اور بے خودی کی عزت ہے کہ نمازی ہی نہیں رہا۔ نماز کیسے پڑھے"۔

ملا صاحب کی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ "مصلی نماند، نماز کے خواند" نمازی نہیں رہا۔ نماز کون پڑھے۔ مگر انھوں نے اس تناقض کی طرف خیال نہیں فرمایا جو خود ان کے استدلال میں واقع ہوگیا ہے۔ یعنی جب وارفتگی اور بے خودی اس حد تک بڑھ گئی۔ کہ ہوش وحواس تو کیا خود اس کا وجود عدم کی برابر ہوگیا تو وہ مخاطب ہی کہاں رہا۔ اور جب وہ خطاب کی صلاحیت نہیں رکھتا تو تکلیف شرعی بھی باقی نہیں رہی۔ مگر ایسے مرفوع القلم کو نماز پڑھنے والوں سے افضل قرار دینا ملا صاحب کا معاذ اللہ "الحاد" ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب یہ حقیقت ہے "کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" پھر کسی کو معاذ اللہ آپ سے افضل قرار دینا الحاد اور زندقہ نہیں تو اور کیا ہے۔

مگر قلندر صاحب کا دامن اس الحاد سے پاک ہے۔ مکتوب کے اقتباسات پہلے گذر چکے ہیں۔ آپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب حقیقی اور معشوق حقیقی قرار دیتے ہیں۔ بس سب سے افضل اور سب سے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی ہر ایک حالت تمام حالتوں سے افضل ہے۔ آپ کی شان سکر دائم سے ہمیشہ بلند رہی۔ تو پھر سکر دائم کو نماز سے افضل کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ؟

بنیادی غلطی

ملا شاہ جیسے لوگوں کی اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے عبادت کے صرف ایک پہلو پر نظر رکھی کہ عبادات گناہوں کا کفارہ ہوا کرتی ہیں۔ اس پر اس زعم باطل کا اضافہ ہوگیا کہ جب سکر دائم ہے تو گناہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پس جب گناہ نہیں تو کفارہ کی بھی ضرورت نہیں۔

مگر وحی الٰہی اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا دوسرا پہلو بھی اتنی ہی قوت سے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ رضاء مولیٰ کا ذریعہ بھی "عبادت" ہی

ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ خداوندی انعامات کا شکر بھی اگر ادا ہو سکتا ہے۔ تو صرف عبادت کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتا ہے۔

کسی قلندر یا مجذوب کے گناہوں کی معافی تو صرف اس کا تخیل ہے۔ جس کے متعلق شریعت کی کوئی سند نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہوں کی معافی کا اعلان خود ربِّ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:۔

"لیغفر لك ما تقدم من ذنبك وما تاخر"

اس کے باوجود نہ صرف پنجوقتہ نمازیں اور ان کی سنتیں اور نفلیں پابندی سے ادا ہوتی تھیں۔ بلکہ شب بیداری کی بھی حالت یہ تھی کہ کئی کئی گھنٹے نفلوں میں کھڑے رہنے کے باعث پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے۔

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نبی اور مقدس رسول کی حیثیت سے فطرتاً معصوم ہیں، گناہوں سے پاک، اس پر بھی اگر کچھ لغزشیں اور خطائیں ہو گئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا اعلان فرما چکے ہیں۔ پھر یہ زحمت کیسی اور دن بھر کی بے پناہ مشغولیت و مصروفیت کے بعد راتوں کو ان لمبی لمبی نفلوں کی کیا ضرورت ہے۔؟

آپ کو معلوم ہے سید الکونین، محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نہایت معقول سوال کا کیا جواب دیا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

"افلا اکون عبداً شکوراً۔"

بیشک اللہ تعالیٰ کے احسانات بے شمار ہیں۔ مگر کیا تقاضائے انصاف ہے کہ اس کے ان احسانات و انعام بے غایات کا شکر نہ ادا کیا جائے۔

گناہوں کے کفارہ کے لئے نہیں بلکہ ادائے شکر کے لئے ضروری ہے کہ:۔

شکر نعمت ہار ، تو چنداں کہ نعمت ہار تو

ادائے شکر کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو عاشق کے لئے نہایت ضروری ہے اتنی ضروری جتنی ماہی بے آب کے لئے قطرہ آب ضروری ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ، یعنی سرگوشی راز و نیاز ، عرض معروض اور مناجات ۔

اس کا ذریعہ کیا ہے ، صرف نماز ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :" نمازی اپنے رب سے سرگوشی اور راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے ۔ (صحاح)

عاشق صادق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار رب معراج میں ہوا تھا ۔ آپ کی اُمت کی معراج یہ تو نہیں ہے کہ عرش و کرسی کی سیر کرے ۔ البتہ مومن کی معراج نماز ہے ۔ (صحاح)

قرب محبوب مقصود ہے تو سب سے زیادہ قرب جو بندے کو اپنے رب سے میسر آتا ہے وہ ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب نماز میں میسر آتا ہے ۔ جب بندہ اپنی پیشانی اپنے رب کے سامنے زمین پر رکھتا ہے ۔

بہر حال قلندر یا مجذوب کے لئے اتنی بات درست ہے کہ جب وہ " عالم خبر " سے " بے خبر " ہوئے ۔ اور ان کے یہاں خبرداری اور " آگہی " کا مدّہ ہی ختم ہو گیا ۔ تو پھر ان کو احکام شریعت کی خبر کہاں سے ہو ۔ جذب دائم ، سکر لازوال ، سرمستی و وارفتگی جس کے لئے بے خبری اور نا آگہی لازم ہے ۔ ان کی زندگی بن جاتی ہے ۔ یہ اگر ختم ہوتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے ۔ ؎

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس بے آگہی میں اگر کہیں آگہی

ہوجاتی ہے تو صحیح قلندر (یعنی جو شخص واقعی عشق مولیٰ کے جذبہ سے وارفتہ اور مغلوب ہوجاتا ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ آگہی، احترام شریعت بلکہ احکام شریعت سے عشق کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے کیونکہ اصل عشق تو یہی تھا اسی کی غیر معتدل افزونی وفراوانی نے یہ بے خودی پیدا کردی ہے۔

کسی اور قلندر کی یہ شان ہو یا نہ ہو، لیکن جس قلندر کے احترام میں ہمارا قلم سرنگوں ہے۔ یعنی شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر ان کی شان تو یہی تھی۔ چنانچہ فرضیت نماز کی معافی کی روایت تو صرف مکالمہ میں ہے جس کو اختراعی قرار دیا گیا ہے۔ مگر جس واقعہ کو تمام سوانح نگاروں نے بلاکم وکاست نقل کیا ہے وہ اسی عشق کی شہادت دیتا ہے جس کو عشق شریعت کہنا چاہیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حالت سرمستی میں حضرت قلندر صاحب کی لبیں بہت بڑھ گئیں، کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ قلندر صاحب کو آگاہ کرے یا خود تراش دے حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب سنائی جو پابندی شریعت کے زیور سے آراستہ اور اتباع سنت کے بارہ میں عام شہرت رکھتے تھے۔ وہ قلندر صاحب کے پاس پہونچے۔ قینچی ہاتھ میں لی۔ ریش مبارک پر ہاتھ رکھا اور لبیں تراش دیں۔ مولانا سنائی اپنا فعل کرچلے۔ مگر اس کے بعد قلندر صاحب کی حالت یہ تھی کہ :۔

"ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے وگفتے این ریش چہ مبارک ریش ست کہ در راہ شریعت محمدی گرفتہ شدہ است۔" (خزینۃ الاصفیاء واخبار الاخیار وغیرہ)

ترجمہ :۔ ریش مبارک کو بوسہ دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ داڑھی کتنی مبارک ہے کہ شریعت محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔"

اس واقعہ کی صحت سے انکار مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعہ اس الزام اور بہتان کی بھی بہت بڑی تردید ہے کہ حضرت قلندر صاحب صوم وصلوٰۃ اور احکام شریعت

کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ کیونکہ جو علماء داڑھی اور مونچھوں کی غیر مسنون ہیئت
برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صوم وصلوٰۃ جیسے بنیادی فرائض کے ترک کو کیسے
برداشت کر سکتے تھے۔ مولانا ضیاء الدین سنامی تو اپنے زمانہ کے مشہور اہلِ بصیرت
فضلاء میں سے تھے۔ اُنکی شان تو بہت بلند ہے۔ شریعت کے ایک معمولی واقف کار
کیلئے بھی یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ نماز روزہ کے ترک سے تو متاثر نہ ہو۔ اور مونچھیں خلاف
سنت ہو جائیں تو ان کی اصلاح کیلئے ہمّت وجرأت کے مظاہرہ میں پوری طاقت صرف
کر دے۔ یہاں تک کہ اپنے سات لڑکوں کو قربان کر دے۔ کیونکہ اس واقعہ کو جس انداز
سے شرف المناقب جیسی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب
نے اس شرعی احتساب کے انجام دینے کے لئے پہلے اپنے لڑکوں کو بھیجا تھا۔ مفتی صاحب
کے سات لڑکے تھے جو لڑکا بھی مقراض لے کر قلندر صاحب کے سامنے جاتا رہا۔ نگاہِ
جلال کی تلوار سے شہید ہوتا رہا۔ جب سات بیٹے شہید ہو چکے تب حضرت مفتی صاحب
خود تشریف لے گئے۔ اور اس خدمت کو انجام دیا۔

بہر حال جو مفتی اور عالم احکام شریعت کے احتساب میں اس قدر باہمت اور
سخت جان ہو کہ صرف ایک سنت پر عمل کرانے کے لئے سات بیٹوں کو قربان کر دے
وہ صوم وصلوٰۃ کے ترک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی کو مرفوع القلم
مجنوں سمجھ کر نماز روزہ جیسے فرائض سے غیر مکلف سمجھتا ہے تو وہ اس کو داڑھی اور
مونچھ کی مستحب یا مسنون ہیئت کے بارے میں بھی لامحالہ غیر مکلف سمجھے گا۔ اور
احتساب کا ارادہ ہی نہیں کرے گا۔

جب یہ واقعہ اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء جیسی مستند کتابوں کے حوالہ
سے حیطہ تحریر میں آیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرف المناقب کی روایت کا
بھی مکمل ترجمہ پیش کر دیا جائے جس سے ناظرین کرام بھی صحیح اور غلط کا اندازہ فرما

سکیں گے۔

"شرف المناقب میں ہے" معتبر اہل سلف سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آں عاشقِ الٰہی (حضرت شرف الدین بوعلی) کی مونچھوں کے بال دراز ہو گئے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کو تراشنے کی فہمائش کر سکے۔ البتہ مولانا ضیاء الدین صاحب سنامی عرف علی مفتی جو علماء شریعت کے مقتدا تھے۔ انھوں نے قصِّ شوارب (مونچھیں کترنے) کے احتساب اور مونچھوں کو سنت کے مطابق تراشنے کے لئے اپنے سات لڑکے بھیجے جو لڑکا بھی حضرت بوعلی کے سامنے مونچھیں تراشنے کے لئے پہونچتا تھا حضرت شرف الدین بوعلی (جو قتال کے لقب سے مشہور ہیں) آپ کی نگاہِ جلال کی تلوار کی ضرب سے شربت شہادت چکھتا تھا۔ مفتی نے کہا الحمد للہ میرے لڑکے شرع محمدی کی راہ میں شہید ہوئے۔ پھر خود اپنے ہاتھ میں مقراض لی اور آنحضرت کے سامنے پہونچے۔ چونکہ قلندر (عاشق) کو ہمیشہ ذات ذوالجلال کا مشاہدہ اور جناب رسالت پناہ کی مجلس مبارک کی حاضری میسر رہتی تھی۔ حکم شریعت کی تعمیل کے لئے سر جھکا کر مفتی صاحب کے اقدام کو قبول کیا۔ جب مونچھیں تراشیں گئیں تو ہر ایک بال کی جڑ سے خون کا قطرہ جاری ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرت (قلندر صاحب) اپنی داڑھی کے بالوں کو اپنے مبارک لبوں سے بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے۔ الحمد للہ یہ داڑھی شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔ چونکہ حضرت قلندر صاحب کے بدن مبارک کا ہر بال یاد الٰہی میں مشغول اور مقام رضا و تسلیم میں سرگرم رہتا تھا تو اتنے بالوں کے جدا ہو جانے کا کسی قدر ملال حضرت قلندر صاحب کو ہوا۔ اور آپ نے فرمایا۔ مفتی تیری قبر گدھوں کی چراگاہ ہوگی۔ جو گدھا گم ہو جایا کرے گا وہ تیری قبر پر ملا کرے گا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عرصہ تک ایسا ہی ہوتا رہا۔

بہر حال یہ تضاد بیانی انھیں مصنف صاحب کا مخصوص حصہ ہے کہ ایک

طرف حضرت قلندر صاحب مفتی ضیاءالدین صاحب کے سامنے اس لئے سر تسلیم خم کردیں کہ قلندر صاحب کو ہمیشہ دربار رسالت کی حاضری میسر رہتی تھی اور دوسری جانب یہی حاضر باش سات نوجوانوں کو ناحق قتل کردیں۔

مختصر یہ کہ اصل واقعہ اتنا ہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے لبیں تراشیں اور قلندر صاحب کو اس پر وجد آگیا کہ اُن کی داڑھی راہ شریعت میں پکڑی گئی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اسباب ترک

ہمارے خیال میں ہر وہ عالم تارک الدنیا ہے جو خدمتِ دین کو اپنی ذاتی منفعت پر مقدم سمجھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ نے ترک دنیا کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے وہ اسی کے مشابہ ہے۔

صحابۂ کرام میں سے تین فرد آستانۂ حرم پر حاضر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور خلوت کے مشاغل کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہیں۔

ان حضرات کے نزدیک ترک دنیا کے معنی یہ تھے کہ انسان کھانا پینا چھوڑ دے۔ ہمیشہ روزے سے رہے۔ رات بھر خدا کی یاد میں مصروف رہے۔ اپنے اوپر سونا حرام کرلے۔ ازدواجی زندگی سے کنارہ کش ہوجائے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندرون خانہ اس طرح رہتے ہیں جیسے ایک گرہستی رہتا ہے۔ گھر کا کام بھی کرتے ہیں۔ اہل وعیال سے خوش طبعی بھی فرماتے ہیں۔ رات کو آرام بھی فرماتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ مگر زیادہ تر افطار کرتے ہیں۔ تو ان تحقیق کرنے والے حضرات کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ زہد وتقویٰ اور ترک دنیا کا جو "معیار" انھوں نے قائم کیا تھا۔ یہ باتیں اس معیار سے کم تھیں۔ مگر جو عقیدت ان صاحبان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی وہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپ کی پاک زندگی کو زُہد وتقویٰ کے معیار سے ساقط اور گری ہوئی قرار دیں۔ تو ان حضرات نے یہ توجیہہ

کی کہ حضرت رسالت مآب ؐ کا کیا کہنا' آپ کی شان نرالی ہے۔ آپ تو "محبوب خدا" ہیں آپ کی تمام خطائیں اور لغزشیں معاف ہیں۔ پس ہمیں اپنے اوپر آپ کو قیاس نہ کرنا چاہیئے۔ آپ جو کچھ بھی کرتے ہوں وہ آپ کا فعل ہے۔ ہمیں تو یہ طے کرنا چاہیئے۔ کہ ازدواجی زندگی ختم کر دیں' رات کو سونا اور دن کو کھانا حرام کر لیں' یعنی پوری رات یادِ خدا میں صرف کیا کریں اور دن بھر روزہ رکھا کریں۔

ان حضرات کے اس فیصلہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپ نے برہمی کے ساتھ فرمایا۔ بیشک میں رات کو سوتا بھی ہوں اور نوافل بھی پڑھتا ہوں دن کو کھانا بھی ہوں اور روزے بھی (جب موقع ہو) رکھتا ہوں۔ میری بیویاں بھی ہیں جن کے حقوق ادا کرتا ہوں۔ یہی دین ہے یہی سنت ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ سے منھ موڑتا ہے۔

بہر حال ترکِ دُنیا یہ نہیں کہ دنیا کی پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے۔ ترکِ دنیا یہ ہے کہ اپنے نفس کے ترجیحی حق کو ختم کر دیا جائے۔ دنیا کی تمام خوشگواریاں اور تمام دلچسپیاں جائز اور مباح ہیں۔ جب تک کوئی دینی مصلحت مقابلہ پر نہ آئے اور جہاں مقابلہ ہو اس وقت دینی مصلحت کو نظر انداز کرنا' طلب دنیا ہے خواہ آپ عیش و رفاہیت میں ہوں یا فقر و افلاس میں۔

ارشادِ ربّانی ہے :۔

"کہہ دیجئے' اگر آپ کے باپ' بیٹے' بیویاں' عزیز و اقارب' دھن دولت' کھیت کیار' باغ باغیچے' دوکان اور تجارت' یا مکان اور جائیداد۔ اللہ اور اس کے رسول اور راہِ خدا میں جانفشانی اور جہاد کے مقابلہ میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ تو تم صاحبِ ایمان تو کیا ایک ایسی قوم ہو جو عذاب کی مستحق ہے" اب تمہیں اللہ کے عذاب کا انتظار کرنا چاہیئے"۔ (سورہ توبہ)

بہر حال ترک دنیا اصل میں ترکِ محبت ہے۔ شان و شوکت یا راحت و آرام کا ترک ہمیشہ ترک دنیا نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ یہ ترک بھی بسا اوقات حُبِّ دنیا بن جاتا ہے۔ (معاذاللہ)

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

پس قلندر صاحب اس وقت بھی تارک دنیا تھے جب وہ "مسجد قوت الاسلام" میں شب و روز مطالعہ اور درس میں مصروف رہتے تھے۔ کیونکہ اس وقت بھی آپ کی بلند و بالا شخصیت حرص و طمع سے پاک اور ذاتی مفاد کی بندشوں سے آزاد تھی۔ غالباً آپ نے اسی زمانہ میں فرمایا تھا۔

زہد و تقویٰ چیست اے مردِ فقیر
لا طمع بودن ز سلطان و امیر
پشت پا زن تخت کیکاؤس را
سر بدہ از کف مدہ ناموس را

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے آخر کار وہ صورت اختیار کی جس کو عام اصطلاح میں ترک دُنیا کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے یعنی سامانِ درس و تدریس و اسباب قضا و فتویٰ کو دریا بُرد کر دیا۔ اور گوشۂ صحرا کو اپنا مسکن بنایا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا۔؟

ایک روایت یہ ہے کہ وہی درویش جنھوں نے ولادت سے تیسرے روز مکان پر تشریف لا کر وہ آیت پڑھی تھی جس کو سنکر اس "قلندر نو مولود" نے گریہ بند کیا تھا، یہی بزرگ مسجد قوت الاسلام میں تشریف لائے۔ حضرت قلندر صاحب درس میں مشغول تھے۔ درویش صاحب نے فرمایا۔ میاں شرف الدین کب تک اس "قیل و قال"

میں پڑے رہو گے۔ قلندر صاحب نے اس سوال کا جواب اپنے عمل سے دیا۔ یعنی کتاب بند، محفلِ درس ترک، صحرا نوردی اور آبلہ پیمائی کو لبیک۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اس سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جس کا تعلق اس زمانہ کے حکمراں سے ہے۔ شیخ محمد صاحب عثمانی مصنف شرف المناقب نے صرف بادشاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا نام نہیں لیا اور محمد مسیح اللہ صاحب پانی پتی نے اپنے غیر مطبوعہ رسالہ میں (جس کو انھوں نے "اُجڑے دیار" سے معنون کیا ہے) غیاث الدین بلبن کا نام لیا ہے کہ اس کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ بیگمات چاہتی تھیں کہ ان کے لڑکا ہو تا کہ بادشاہ کا تقرب زیادہ ہو اور دوسری جانب یہ واقعہ ہوا۔ کہ کوئی شخص حضرت شیخ شرف الدین صاحب کے پاس آیا۔ اور عرض کیا کہ ہمارے پیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور انھوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ غسل جنازہ کے وقت ان کی لنگوٹی نہ کھولی جائے۔ آیا اس طرح غسل دینا جائز ہے یا نہیں۔ حضرت شیخ شرف الدین صاحب نے ناجائز قرار دیا۔ تو اس شخص نے عرض کیا کہ میں تو اپنے پیر کی وصیت کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مہربانی فرما کر آپ زحمت گوارا فرمایئے اور تشریف لے چلئے۔ شریعت کے مطابق غسل کرا دیجئے۔

حضرت قلندر صاحب اس کے ساتھ ہو لئے۔ تھوڑی دور چل کر دیکھا۔ کہ ایک سڑک کے کنارے پر ایک فقیر مرا پڑا ہے۔ لنگوٹی کسے ہوتے ہے۔ حضرت قلندر صاحب نے اس کو غسل دینا شروع کیا اور لنگوٹی کھولنی چاہی وہ مُردہ فقیر اُٹھ بیٹھا اور کہا: "جہاں نامرد لنگوٹ پر ہاتھ ڈالیں وہاں مرنا بھی مناسب نہیں ہے۔" یہ کہہ کر چل دیا۔

حضرت قلندر صاحب ششدر رہ گئے۔ اس شخص سے جو ساتھ لے گیا تھا اصل معاملہ دریافت کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ مولانا یہ فقیری ہے۔ تمھیں اگر یہ نکتہ معلوم ہوتا۔ تو تم باپ اور بیٹی کا نکاح ہی کیوں کرتے۔ اب تو شیخ بو علی صاحب اور بھی چکرائے اور سیدھے بادشاہ کے محل پر پہونچے۔ بادشاہ کو کل ماجرا سنایا۔ بادشاہ خود پریشان تھا۔ فوراً تحقیقات کی تو معاملہ کھل گیا۔ بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے ایک عظیم مصیبت سے بچایا۔

اس واقعہ نے مولانا شرف الدین بو علی پر یہ اثر کیا کہ آپ نے کتابیں دریا میں غرق کیں اور فرمایا:۔

جبہ و دستارِ علم و قیل و قال
جملہ در آبِ رواں انداختم

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہندی کا یہ دوہا پڑھا:۔

پنڈت لیکھیا پانچ کر بولتی پانی پور
سگرے اچھر میٹ کر من میں سائیں توڑ
پوتھی تو تھوتی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
ایک اچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

یہ واقعہ جس میں سراسر افسانوی رنگ ہے ممکن ہے اصلیت رکھتا ہو اور کسی لاعلمی کی بنا پر حضرت شیخ نے کوئی ایسا نکاح پڑھ دیا ہو جو شرعی جواز سے محروم ہو۔ مگر ہمارے خیال میں اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کو آپ کے اس فیصلہ اور عمل میں بہت بڑا دخل ہے۔ آپ کی مثنوی سے اس کی شہادت مہیا ہوتی ہے جو عنقریب پیش کی جائے گی۔ (انشاء اللہ)

اگر "حکمنامہ" وغیرہ کی روائیتوں پر اعتبار کیا جائے کہ آپ چالیس سال

کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ پھر چالیس سال آپ نے خدمت درس انجام دی۔ اور بیس سال عہدۂ قضا پر فائز رہے تو اس طرح سو سال کی عمر کے بعد آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس کو قلندری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی جب آپ کی عمر سو سال پورے کر چکی تب آپ نے دنیا ترک کی۔ اور اگر عہدۂ قضا کے بیس سال کو مدتِ درس میں شامل کر لیا جائے۔ یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ بیس سال تک صرف درس دیتے رہے اور بیس سال درس کے ساتھ فرائض قضا بھی انجام دیئے جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ قاضی اور جج صاحبان عدالت سے فارغ ہو کر دوسرے اوقات میں درس بھی دیا کرتے تھے تو اس طرح آپ نے اسّی سال کی عمر میں یہ "ترک" اختیار کیا۔

"گلزار ابرار" میں "حکمنامہ" کے بجائے "حکمت نامہ" تحریر ہے حکمت نامہ کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ شیخ شرف الدینؒ نے فرمایا۔ میری عمر چالیس سال تھی۔ جب میں دہلی پہونچا۔ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ پھر درس و افتار میں مشغول ہو گیا اور بیس سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ پھر جذبۂ ربانی طاری ہوا۔ درس و افتار بند کیا اور اللہ کی زمین کی سیاحت شروع کی۔ شیخ شمس الدین تبریزی اور شیخ جلال الدین رومیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دونوں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد ہندوستان واپس آیا اور جو کچھ سامانِ درس و تدریس تھا۔ اس کو "دریائے جمن" کی نذر کر دیا۔ گلزارِ ابرار کی اس روایت کو اگرچہ مولانا عبدالحیٰ صاحب نے بھی "نزہۃ الخواطر" میں نقل کر دیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کہ آپ کی عمر ۴۰ سال تھی جب آپ دہلی آئے۔ اس روایت کا باقی حصہ مجروح ہے پہلی جرح تو یہ ہے کہ اس روایت میں "مدت درس" بیس سال بیان کی ہے۔ حالانکہ خود حکیم صاحب نے چند سطر اوپر تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"اشتغل بالعلم فدرس وافاد ثلاثین سنۃ۔"

(نزہۃ الخواطر ج ۳ صفحہ ۵)

ترجمہ:۔ (علم میں مشغول رہے۔ تیس سال تک درس و تدریس کا فیض جاری رکھا)

پھر اگر بیس سال بھی مدتِ درس تسلیم کر لی جائے۔ تو دوسری جرح یہ ہے کہ زمانۂ سیاحت میں تبریز پہونچ کر شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کی بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوتی۔ کیونکہ قلندر صاحب کا یہ سفر سیاحت کم از کم ۶۶۴ھ میں شروع ہوا ہوگا۔ حالانکہ حضرت شمس الدین تبریزی اس سے اٹھارہ سال پہلے ۶۴۵ھ میں شہید کئے جا چکے ہیں۔ بیشک حضرت جلال الدین رومیؒ کی وفات ۶۷۲ھ میں ہوئی۔ مگر کسی اور روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی کہ قلندر صاحب کی ملاقات حضرت مولانا رومیؒ سے ہوئی۔ ہاں یہ درست ہے کہ قلندر صاحبؒ نے اپنی مثنوی میں بار بار مولانا روم کا ذکر فرمایا ہے مگر اس سے یہ ضروری نہیں ہو جاتا کہ مولانا روم سے ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔

بہر حال جب قلندر صاحب کا سنہ ولادت ۶۰۴ھ ہے۔ اور چالیس سال کی عمر میں آپ دہلی تشریف لائے تو اتنی بات تو ثابت ہوئی کہ دہلی میں آپ کی تشریف آوری ۶۴۴ھ میں ہوئی ہے۔ اتفاق سے یہی وہ سال ہے جس کے پہلے مہینے یعنی محرم الحرام سے سلطان ناصر الدین محمود (اول) کی سلطنت شروع ہوتی ہے۔

ناصر الدین محمود سلطان شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ شمس الدین التمش کی ۲۵ سالہ سلطنت ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ (مئی ۱۲۳۶ء) میں اس کی وفات پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد اگرچہ قاعدہ کے مطابق اس کے بڑے لڑکے اور ولی عہد رکن الدین فیروز شاہ کو تاج پہنایا گیا۔ مگر اس کی ناقابلیت نے سات ماہ سے زیادہ اس کو سلطنت کی مہلت نہیں دی۔ ۶۳۴ھ کے وسط میں امراء دولت نے

اس کو معزول کرکے اس کی بہن رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کر دیا۔ مگر اس کو بھی صرف
تین سال کی مہلت ملی۔ ۶۳۷ھ میں اس قابل اور بہادر خاتون اور اس کے
نئے شوہر دونوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس کی جگہ اس کے بھائی معزالدین
بہرام شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن دو ہی سال کے بعد اس کو بھی معزول کرکے قتل
کر دیا گیا اور اس کی جگہ رکن الدین فیروز شاہ کے لڑکے علاء الدین مسعود شاہ کو
سلطنت کی باگ ڈور دیدی گئی۔ مگر یہ غریب بھی دانش و جرأت سے محروم تھا زیادہ
عرصہ زمام سلطنت نہ سنبھال سکا، صرف چار سال گذرنے پائے تھے کہ اراکین
دولت اس سے بھی متنفر ہو گئے۔ ۲۶ محرم ۶۴۴ھ کو اُسے معزول کرکے قید میں
ڈال دیا۔ اب جس کو سلطنت کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ یہی ناصر الدین محمود اول تھا
جس کا ذکر چند سطر پہلے آچکا ہے۔

ناصر الدین محمود وہ بادشاہ ہے جو نہ صرف اس خاندان میں جس کو "خاندان
غلامان" کہا جاتا ہے سب سے زیادہ نیک نفس، عادل اور رحم پرور تھا۔ بلکہ دہلی
کے تمام بادشاہوں میں اس کو وہ امتیاز حاصل ہے جو کسی دوسرے کو میسّر نہیں آیا۔

اس بے چارے نے اپنے والد سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد
سے اب تک گیارہ سال نظر بندی میں گذارے تھے۔ لیکن اس کی یہ دانشمندی
تھی کہ نظر بندی کے اس دور کو اس نے خفیہ سازشوں یا خواب و راحت میں ضائع
نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس فرصت کے ایک ایک لمحہ کو اپنی سیرت کی تعمیر میں صرف کیا۔

کتابوں کے مطالعہ سے اس کو شغف تھا اور اپنی محنت سے اپنا رزق
فراہم کرنا اس نے اپنی زندگی کا پروگرام بنا لیا تھا۔ یہ بہترین خطاط تھا۔ اس نے
کتابت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ اسی کی آمدنی سے وہ گذر اوقات کرتا تھا۔

وہ بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھا، تب بھی اس کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹا۔ ایسی

تدبیریں بہت سی اختیار کیں جن سے اہلِ ملک کی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مگر اپنی زندگی کا معیار وہی قائم رکھا جو نظر بندی کے زمانہ میں تھا۔ نوکر رکھنے کی استطاعت نظر بندی کے زمانہ میں نہیں تھی۔ گھر کا کھانا خود بیوی پکاتی تھی۔ جب یہ بادشاہ، اور بیوی ملکۂ جہاں بنی۔ تب بھی اپنے خادم وہ خود ہی رہے۔ بیوی خود ہی روٹی پکاتی، گھر کا کام خود ہی کرتی اور بادشاہ کتابت کی مزدوری کرتا اور امورِ سلطنت سے فراغت پاتا تو اپنے کپڑے خود سینے لگتا تھا۔

یہ حُسنِ اتفاق تھا کہ حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ دہلی پہونچے۔ تو دہلی کی قسمت بھی سلطان ناصر الدین محمود جیسے انصاف پسند، پاکیزہ سیرت، نیک بادشاہ کے آفتاب اقبال سے چمک اٹھی۔

قدرت کی فیاضیوں نے اس کو وزیر بھی ایسا ہی نیک نفس، نیک نیت، باتدبیر اور وفادار دیا تھا۔ "غیاث الدین بلبن" جس کا نام آج تک عزت سے لیا جاتا ہے۔ وہ اس کا وزیر تھا۔

وزیرے چنیں شہریارے چناں
جہاں چوں نگیرد قرارے چناں

حضرت شیخ شرف الدین جب ۶۴۴ھ میں دہلی پہونچے۔ تو سلسلۂ درس تو آپ نے کچھ دنوں بعد ہی شروع کر دیا۔ مگر عہدۂ قضا یقیناً اس وقت نہیں ملا ہوگا۔ اگرچہ مکالمہ کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ کہ چالیس سال بعد اس عہدہ پر فائز ہوئے مگر یہ یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال بعد سیاست کا وہ گھناؤنا دور آتا ہے۔ جس میں بوعلی شاہ قلندر تو کیا معمولی درجہ کا نیک سیرت انسان بھی عہدۂ قضا قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

مختلف روایتوں کے ملانے سے بطور قدر مشترک جو بات ثابت ہوتی ہے

وہ یہ ہے کہ قریباً چالیس سال آپ نے درس اور منصب قضا کی خدمت میں صرف کیے۔
قیاس یہ ہے کہ جس طرح آپ کا دہلی پہونچنا اس مبارک اور مسعود وقت میں ہوا تھا جب سلطان ناصر الدین محمود جیسے سلطان عادل کے عروج سے دہلی کی قسمت جاگی تھی۔ ایسے ہی جب یہ دور ختم ہوا اور سرزمین دہلی پر بادشاہوں کا خون بہنے لگا۔ تو حضرت قلندر صاحب نے رختِ سفر باندھا اور نہ صرف شہر دہلی کو خیر باد کہا۔ بلکہ شہری زندگی ہی کو "الوداع" کہہ دیا۔

سلطان ناصر الدین محمود بیس سال حکومت کر کے جمادی الاول ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں اس دار فانی سے رخصت ہوا تو امرائے دولت نے اس کے وزیر غیاث الدین بلبن کو جس کے عادلانہ جوہر اور نظامِ سلطنت کی بہترین قابلیت کا تجربہ زمانۂ دراز سے کرتے چلے آئے تھے، بادشاہ بنا دیا۔ یہ اسی طرح منصفانہ شان اور بہادرانہ شوکت سے بائیس سال تک سلطنت کرتا رہا۔ ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ء) میں جب اس کی عمر تقریباً ۸۵ سال تھی۔ اس نے بھی جانِ شیریں جان آفرین کے حوالہ کی لیکن اس کی وفات کے بعد فوراً ہی دہلی کا ستارۂ اقبال گردش میں آگیا۔
غیاث الدین بلبن نے سوچ سمجھکر اپنے پوتے "کیخسرو" کو ولی عہد بنایا تھا لیکن اس کے دوسرے پوتے "کیقباد" کی سازش غالب آئی۔ کیقباد نے خود تخت سلطنت پر قبضہ کیا اور ولی عہد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ لیکن اس کی سازشی سلطنت کامیاب نہیں ہوئی۔ ایک فوج کا کمانڈر شائستہ خاں خلجی سامنے آیا۔ اس نے کیقباد کو "کلوکھڑی" کے محل میں قتل کروا کر اس کی لاش محل کی کھڑکی سے دریائے جمنا کی ریتی میں پھنکوا دی۔

عوام کے ہیجان کو فرو کرنے کے لئے اس وقت کیقباد کے تین سالہ لڑکے "کیومرث" کو بادشاہ بنا دیا۔ اور جب حالات کسی قدر معتدل ہو گئے تو اس تین سالہ بچے کو بھی

ذبح کرا کر ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں خود تاج سلطنت اپنے سر پر رکھ لیا۔ مختصر یہ کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات سے صرف تین سال کے اندر نہ صرف یہ کہ دو بادشاہ قتل کئے گئے بلکہ اس خاندان کی سلطنت ہی ختم ہو گئی۔ اور اب خلجی سلطنت کا آغاز ہوا جس کا بانی یہی شائستہ خاں ہے جس نے اپنا لقب اور خطاب جلال الدین فیروز شاہ اختیار کیا۔

چاہ کندہ را چاہ در پیش

چشمِ عبرت کے لئے کتنا عجیب و غریب سبق ہے کہ یہی شائستہ خاں اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کے باوجود پورے چھ سال بھی حکومت کرنے نہیں پایا، کہ ۶۹۵ھ میں خود اس کے پروردہ برادرزادہ اور داماد نے اس کو قتل کر کے تاج بادشاہت اپنے سر پر رکھا۔ اور بادشاہ کے سر کو جھنڈے پر آویزاں کر کے پورے لشکر میں گشت کرایا۔

یہ بھتیجے صاحب جس نے اپنے خسر اور چچا کو قتل کیا "علاء الدین خلجی" ہیں۔ شائستہ خاں نے اس کو گورنر بنا رکھا تھا۔ مگر علاء الدین کی نظریں بہت اونچی تھیں وہ صرف گورنری پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ اول اس نے جنوبی ہند پر حملہ کر کے برار اور خاندلش وغیرہ کو فتح کیا۔ اور جب وہاں سے پلٹا تو اب اس کی نظر بادشاہت کے سوا کسی اور پر نہیں جمتی تھی۔ اُس نے اپنے چچا شائستہ خاں کو اپنے قیام گاہ "کڑہ مانکپور" آنے کی دعوت دی۔ چچا اگرچہ بحیثیت داماد کے علاء الدین سے خوش نہیں تھا۔ کیونکہ میاں بیوی اور ساس داماد کے تعلقات اچھے نہیں تھے لیکن ہونہار بھتیجے کی حیثیت سے بہت خوش تھا۔ بھتیجا جو غیر معمولی فتوحات کے بعد واپس آیا تھا جب اس نے ملاقات کے لئے دعوت دی تو شائستہ خاں (جلال الدین فیروز شاہ) سے نہیں رہا گیا۔ اعوان سلطنت نے منع بھی کیا۔ مگر اس کو اپنے بھتیجے اور خود اپنی

ہمت پر اتنا اعتماد تھا کہ گنگا کے راستہ "کڑہ مانکپور" پہونچ گیا۔ کشتی وسط رمضان میں کڑہ مانکپور کے قریب پہونچی۔ علاءالدین استقبال کے لئے کشتی پر آیا۔ اور بغل گیر ہوتے ہی خنجر چچا کی بغل میں رسید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دہلی میں بادشاہ کے حادثہ کی خبر پہونچی تو ملکہ جہاں نے اپنے بیٹے رکن الدین ابراہیم شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ مگر یہ بادشاہت صرف اس وقت تک تھی۔ جب تک علاءالدین کا لشکر جرار دہلی نہیں پہونچا تھا لشکر کے پہونچنے میں چار ماہ صرف ہوئے۔ اور جب جنوبی ہند کا فاتح لشکر لے کر دہلی پہونچ گیا تو رکن الدین ابراہیم شاہ کی بادشاہت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ رکن الدین کی زندگی کا تو سوال ہی کیا، ساتھ میں اس کی ماں اور اس کے دوسرے عزیزوں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

یہی علاءالدین ہے جس کا تذکرہ تمہیدی مضمون میں گذر چکا ہے جس کے متعلق حضرت امیر خسرو کے الفاظ یہ تھے کہ "مہذب ڈاکو" ہیں۔

بادشاہت کے متعلق ان بادشاہوں کا نظریہ یہ تھا کہ "بادشاہت بانجھ ہوتی ہے" نہ اس کا کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ قرابت، لہذا بادشاہت کے لئے ہر ایک کا خون مباح ہے خواہ کوئی ہو۔

بہر حال اس جرم کے بعد جو خود علاءالدین کی نظر میں ممکن ہے جرم نہ ہو۔ اس کی بادشاہت ضابطہ اور قاعدہ کی بادشاہت رہی۔ چنانچہ اس کا شمار ہندوستان کے کامیاب بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کا دور حکومت ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) تک رہا۔ شوال ۷۱۶ھ میں اس نے بھی عالم جاودانی کو رخت سفر باندھا۔

جہاں را چنیں ست آئین و داد
که جز مرگ کس را ز مادر نہ زاد

علاءالدین کے بعد پھر افراتفری پھیلی، اور طوائف الملوکی کا دور ہوا۔ یہاں

تک کہ حضرت بو علی شاہ قلندر کے سنہ وفات ۷۲۴ھ تک تخت شاہی کو تین مرتبہ "قتل گاہ" بننا پڑا۔

سلطان علاء الدین کے بعد اس کے سب سے چھوٹے لڑکے شہاب الدین عمر کو تخت نشین کیا گیا جو صرف ایک سال سلطنت کر سکا۔ قطب الدین مبارک اول نے اس کو قتل کر کے سریر سلطنت پر قدم رکھا۔ وہ بھی ۴ سال سے زیادہ جم نہ سکا۔ ۷۲۰ھ میں ناصر الدین خسرو نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے خاندان کے افراد کو بھی تہہ تیغ کیا کہ کوئی اس کے مقابلہ پر نہ آسکے۔ لیکن اپنی تمام تدبیروں کے باوجود قدرت کے دستِ قہر سے نجات نہ پا سکا۔ پنجاب کے گورنر غیاث الدین تغلق نے عَلم بغاوت بلند کیا اور خسرو کو گرفتار کر کے حکم دیا کہ جس جگہ خسرو نے قطب الدین کو قتل کیا تھا۔ اسی مقام پر اس کو قتل کیا جائے۔ خسرو خاں نے اپنی بادشاہت کے تحفظ کے لئے خاندانِ خلجی کے تمام ایسے افراد کو قتل کروا دیا تھا جن سے مقابلہ کا خطرہ تھا۔ اب خسرو خاں کے قتل ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اور ۷۲۱ھ سے یہ تخت خاندان تغلق کے حوالہ ہوا جس کا بانی یہی غیاث الدین تھا۔ جو ۷۲۵ھ میں مکان کے نیچے دب کر مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بیٹے برنا شاہ نے وہ مکان بنوایا ہی ایسا تھا کہ معمولی جھٹکے سے گر جائے۔ چنانچہ چند مست ہاتھیوں نے جو لڑ رہے تھے مکان میں ٹکر ماری اور یہ محل اس طرح گر گیا کہ غیاث الدین تغلق کی بادشاہت کو بھی لے بیٹھا۔

یہاں بادشاہوں کی سوانح عمری لکھنی مقصود نہیں ہے بلکہ اس سیاسی افراتفری کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے۔ جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ حضرت شاہ بو علی قلندر کے تارک ہونے کا بڑا سبب بنی۔

سیاسی بحران کا اثر علماء اور مشائخ پر

یہ سیاسی بدحالی اور خودغرضی و خود پرستی کا بحران جس طرح ختم ہونے والے بادشاہ اور اس کے خاندان کے لئے مصیبت ہوتا تھا وہ ان کے لئے بھی آزمائش بن جاتا تھا جو عالم اور مفتی کہلاتے۔ یا مذہبی لحاظ سے عوام میں اثر درسوخ رکھتے تھے۔ کیونکہ عوام کا رجحان مذہبی تھا۔ ہر ایک قاتل وسفاک بادشاہ اپنی خودغرضی کے راستہ پر قدم بڑھاتا ہوا یہ چاہتا کہ کوئی مذہبی نشان بھی اُس کے ہاتھ میں ہو جس سے وہ اپنی اس سفاکی اور خونریزی کا جواز ثابت کرسکے اور اس طرح عوام کے ہجوم کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔

وہ نام کے علماء جن کی نظر اپنے اقتدار، اپنے مفاد، شاہی وظیفہ اور جاگیر پر ہوتی تھی، وہ پوری قابلیت صرف کرکے دریا کی تہ میں سے یہ کوڑی نکالتے تھے اور بادشاہ جہاں پناہ کے لئے کوئی نشان فراہم کرتے تھے۔ لیکن حق پرست و خداترس علماءً کے لئے یہ مصیبت دوہری ہوجاتی تھی۔ ایک طرف بادشاہ کی ٹیڑھی ترچھی نگاہ، جو بسا اوقات "برق خرمن سوز" کا کام کرتی تھی اور دوسری جانب شاہ پرست علماء کا طعن وتشنیع جوانِ شکستہ دل، علماء ربانی کے لئے تیر ونشتر سے بھی زیادہ تیز ہوتا تھا۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر جب حضرت قلندر صاحبؒ کی مثنوی گنگنائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ اسی پس منظر کی ایک تصویر ہے اور "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" میں حضرت قلندر صاحب نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے۔ جس کے دل شکن اور ہوش رُبا اثر نے حضرت قلندر صاحب کو ترک دنیا پر مجبور کیا تھا۔

ان حالات نے معاشرہ اور سماجی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے۔ اور عوام کی حالت کس درجہ تباہ ہے۔ اس کی تصویر ملاحظہ فرمایئے۔

ارشاد ہے:۔

از جہاں مہر و وفا معدوم شد
حال مردم یک بیک معلوم شد

ترجمہ :۔ محبت اور وفاداری دنیا سے معدوم ہو چکی ہے، لوگوں کی حالت یک بیک معلوم ہوگئی ہے

اے دریغا وضع نیکاں شد بدل
در دیارِ حکم افتادہ خلل!

ترجمہ :۔ افسوس نیک لوگوں کی وضع بدل گئی۔ دنیائے عدل و انصاف میں خلل پڑ گیا۔

تیغ ممسک شجرۂ احساں بُرید
ہم چو عنقا ہمت از عالم پرید

ترجمہ :۔ بخیل کی تلوار نے حُسن سلوک کے درخت کو کاٹ ڈالا۔ ہمت اور حوصلہ عالم سے ایسے ہی اُڑ گیا۔ جیسے عنقا کی جنس ضائع ہوگئی۔

ہمتے رفتست از شاہ و گدا
منعماں گشتند گدائے بے نوا

ترجمہ :۔ شاہ اور گدا، دونوں سے ہمت اور حوصلہ کی جنس ضائع ہوگئی۔ دولت مند بھی گدائے بے نوا بن گئے۔

ہمتے برخاست از صاحبدلاں
دارم از دست زمانہ صد فغاں

ترجمہ :۔ اہلِ دل اور رُوحانی لوگوں سے بھی ہمت مفقود ہوگئی۔ دستِ زمانہ سے سینکڑوں بار آہ و فغاں حسرت و ماتم۔

رحم از دلہائے مردم شد نہاں
سختیے پیدا شدہ بر مردماں

ترجمہ :۔ انسانوں کے دلوں سے رحم بھی پردہ پوش ہوگیا۔ لوگوں میں ایک قسم کی سختی پیدا ہوگئی ہے

خلق نیکو شد زعالم ناپدید
طبع مردم سگ صفت گشتہ پلید

ترجمہ :۔ اچھے اخلاق دنیا سے ناپید ہو گئے۔ آدمیوں کی طبیعت کتوں کی طرح پلید ہو گئی۔

یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب رہے خواص تو دولت مند امراء کی حالت یہ ہے۔

نیست رحمے در دلِ اہلِ دول
شیوۂ اہلِ دول باشد دغل

ترجمہ :۔ دولت مندوں کے دلوں میں رحم نہیں ہے۔ دولت مندوں کا طریقہ دھوکا اور مکر و فریب ہے۔

اہلِ دنیا بہر سیم و مال و زر
گر بدست آید خورند خونِ جگر

ترجمہ :۔ دنیا داروں کی حالت یہ ہے کہ سونا چاندی اور مال کی خاطر اگر ہو سکے تو جگر کا خون بھی پی لیں۔

آں شنیدی کہ زبرائے عز و جاہ
بے گنہ کردند یوسف را بچاہ

ترجمہ :۔ تم نے سنا ہو گا کہ عزت اور جاہ کی خاطر حضرت یوسف (علیہ السلام) کو بلا کسی قصور کے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔

از حسد بے رحمئ اخوال ببیں
حالِ زار یوسف کنعاں ببیں

ترجمہ :۔ حسد کے باعث بھائیوں کی آپس کی بے رحمی دیکھنا چاہو تو یوسف کنعان کا حالِ زار دیکھ لو۔

تاجدار بادشاہوں کی حالت ملاحظہ فرمائیے :۔

بر سرت باشد ترا گر تاجِ زر
کس نیاید از تکبر در نظر

ترجمہ:۔ اگر تمھارے سر پر سونے کا تاج ہو تو تکبر کی یہ حالت ہو کہ کوئی بھی نظر میں نہ آئے

بلکہ رُو تابی چو نمرود از خدا
گم کنی خود را نترسی از جزا

ترجمہ:۔ بلکہ نمرود کی طرح خدا سے بھی منہ موڑ لو۔ اپنے آپ کو ایسا وارفتہ کرلو کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔

حرص افزوں می شود از مال و زر
قطع گردد حب فرزند و پدر

ترجمہ:۔ مال وزر سے حرص میں اور اضافہ ہوتا ہے (یہاں تک کہ) بیٹے اور باپ کی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ہیچ جا دیدے گدار بے نوا
رو بگرداند چو فرعون از خدا

ترجمہ:۔ اگر کسی جگہ کوئی گدائے بے نوا نظر پڑ جائے تو اس سے اس طرح منہ موڑ لیتا ہے۔ جیسے فرعون نے خدا سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان تاجداروں کی سفاکی اور بربریت کی حالت ملاحظہ فرمایئے۔

بادشاہاں را ببیں کز بہر مال
خون اخوان و پدر دانند حلال

ترجمہ:۔ بادشاہوں کو دیکھو کہ مال کی خاطر بھائیوں اور باپ کے خون کو بھی جائز اور حلال سمجھتے ہیں[1]

---

[1] غالباً علاؤالدین خلجی کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ ہو)

حکومت اور معاشرہ یعنی راج اور سماج گویا دامن اور چولی ہیں۔ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ بادشاہ اور امراء اگر عظمت و اقتدار، عیش و عشرت اور دولت و ثروت کے حریص ہوتے ہیں تو عوام میں بھی ان کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے اپنے انداز میں عظمت و جاہ اور عیش و عشرت کے عاشق ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بادشاہوں اور ارکانِ دولت کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ اس کے بل بوتے پر اپنی آرزوئیں پوری کرتے ہیں یا ان آرزوؤں کی راہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ عوام جن کے ہاتھ میں

(بقیہ حاشیہ صد ۹۳ کے بعد ملاحظہ ہو)

کٹرہ مانک پور میں گنگا کے کنارے جلال الدین فیروز شاہ کے قتل کا واقعہ گذر چکا ہے۔ کہ علاؤ الدین نے بغل گیر ہوتے ہوئے بغل میں خنجر رسید کر دیا تھا۔ بیشک اس کا سبب ایک وہ بھی تھا جس کی طرف وہاں اشارہ کیا تھا یعنی علاؤ الدین کا شوق سلطنت اور گورنر کے بجائے بادشاہ بننے کا جذبہ ۔ مگر مورخین نے اس کا سبب ایک اور بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ علاؤ الدین خلجی نے جنوبی ہند کی فتوحات میں بے شمار دولت حاصل کی تھی۔ سونے اور چاندی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سچے موتی، زمرد، لعل اور یاقوت منوں کی مقدار میں وصول کئے گئے تھے۔ مثلاً سات من زمرد۔ دس من موتی وغیرہ۔ اسلامی اصول کے مطابق یہ تمام مال غنیمت یکجا جمع ہوتا پھر اس کا ایک حصہ مجاہدین کو دیا جاتا۔ ایک حصہ فقراء اور مساکین کے لئے مخصوص ہوتا باقی بیت المال یعنی قومی فنڈ میں محفوظ کیا جاتا۔ مگر یہ بادشاہ اسلامی اصول پر عمل پیرا نہیں تھے۔ اب علاؤ الدین نے کچھ حصہ شاہی خزانہ کے لئے دہلی بھیجدیا۔ باقی سب اپنے پاس رکھ لیا۔ بادشاہ نے اصرار کے جانب بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ آخر کار جلال الدین کو خیال ہوا کہ وہ خود علاؤ الدین کے پاس جائے تو میرے جانے کا لحاظ کر کے وہ یہ دولت مجھے دیدے گا۔ مگر علاؤ الدین نے بادشاہ کے اس حُسن ظن کا یہ جواب دیا۔ کہ جب تک بادشاہ دہلی میں تھا اس کو اس طرح خوش آمدید کہا کہ بادشاہ نے اپنے ساتھ فوج لے جانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور جب بغل گیر ہوا تو اس کا استقبال خنجر آبدار سے کیا۔ بس علاؤ الدین (بھتیجے اور داماد) نے صرف دولت کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے چچا اور خسر اور مربی کا خاتمہ کیا۔ قلندر صاحبؒ غالباً اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

تلوار نہیں ہوتی یا سماجی نقطۂ نظر سے شمشیر بکف ہونا اُن کے لئے نا زیبا ہوتا ہے وہ ان آرزوؤں اور غلط جذبات کی تکمیل کے لئے وہ راستے اختیار کرتے ہیں۔ جن کو مکر وفریب دجل اور نمائش کہا جاتا ہے۔ یہی پست جذبات اور غلط آرزوئیں ہوتی ہیں۔ جو ایک ایسے شخص کو جو اپنی فطرت کے لحاظ سے ان عوام سے بھی کمتر ہوتا ہے۔ جن کو "کالا لغام" کہا جاتا ہے۔ اس کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو صوفی صافی، شیخ طریقت اور عالم وفاضل کے روپ میں پیش کرے۔ تاکہ لوگ اس کی تعظیم کریں اور یہ عزت واحترام کی کرسی حاصل کرسکے۔ یہ درحقیقت بدترین اغراض پرست ہوتے ہیں جو اپنی حیثیت وفطرت کے برخلاف رنگ برنگ آئینوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کی نفس پرستی نے جس طرح معاشرہ اور سماج کو تباہ کیا تھا۔ اور تباہ شدہ سماج میں جس طرح یہ ہوا پرست نمائشی زاہد وصوفی نمودار ہوتے تھے اور اپنی اس نمائش کو حقیقت ظاہر کرنے کے لئے جو جو ہتھکنڈے وہ استعمال کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے قلندر صاحب کو ان تمام باتوں کا بارہا تجربہ ہوا تھا۔ اور جن چیزوں سے اُکتا کر انھوں نے دنیا کو پس پشت ڈالا تھا۔ اس میں اس عنصر کثیف وخبیث کا بھی حصہ کافی تھا۔ اس پس منظر کے مطالعہ کے بعد مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

فرماتے ہیں:۔

زہد وتقویٰ نیست ایں کز بہر خلق
صوفی باشی و پوشی کہنہ دلق

ترجمہ:۔ زہد وتقویٰ یہ نہیں ہے کہ مخلوق کی خاطر صوفی بنو اور پُرانی گدڑی پہنو۔

شانہ ومسواک وتسبیح و ریا
جبہ و دستار وقلب بے صفا

ترجمہ :- شانہ بھی ہو، مسواک اور نمائشی تسبیح بھی ہو، جبہ و دستار بھی ہو مگر دل اسی طرح گندہ اور آلودہ رہے۔

پیش و پس گردد مریدِ ناخلف
چوں خرِ ابلہ پئے آب و علف

ترجمہ :- آگے پیچھے نالائق مریدوں کا ہجوم ہو جس طرح خرِ ابلہ گھاس اور پانی کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔

چوں بہ بینی چند کس بیہودہ گرد
خویش راگوئی منم مردانہ مرد

ترجمہ :- جب آگے پیچھے چند بیہودہ لوگوں کو دیکھو تو سمجھ لو کہ میں ہی مرد مرداں ہوں۔

دام اندازی برائے مرد و زن
خویش راگوئی منم شیخ زمن

ترجمہ :- عورتوں اور مردوں کے لئے مکر کا جال بچھائے رکھو۔ اور یہ دعویٰ کرتے رہو کہ شیخ زمن میں ہی ہوں۔

وعظ گوئی خود نیاری در عمل
چشم پوشی ہمچو شیطان دغل

ترجمہ :- دوسروں کو وعظ اور خود عمل نہیں۔ لعین و مکار شیطان کی طرح آنکھ بند کئے رہیں۔

مکر و تلبیس و ریا کارت بود
ہر نفس شیطاں ترا یارت بود

ترجمہ :- مکر و تلبیس، نمود و نمائش تمہارا کام ہو۔ ہردم شیطان تمہارا یار و مددگار رہے۔

خادماں گویند ایں شیخ زماں
چشم پوشیدہ است از خلق و جہاں

ترجمہ :- خادم یہ شہرت دیں کہ یہ زمانہ بھر کے شیخ طریقت ہیں۔ ساری مخلوق اور سارے جہاں سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔

ایں خوشامد گوئے چندیں ابلہاں

رہزنانند، رہزنانند، رہزناں

ترجمہ :- یہ خوشامدی، بے وقوف، ڈاکو ہیں ڈاکو۔

از ستائش خویشتن را گم مکن

عیب خود بیں عیب بر مردم مکن

ترجمہ :- ان کی تعریف سے اپنے آپ کو گم مت کر اپنے عیبوں پر نظر رکھو دوسروں کے عیب نہ نکالو۔

خود بدہ انصاف اے اہل دغل

دل پُر ست از مکر و مصحف در بغل

ترجمہ :- اے فریب خوردہ اگر ہو سکے تو خود انصاف کر۔ دل مکر سے بھرا ہوا ہے۔ اور قرآن شریف بغل میں ہے۔

صوفیم گوئی نداری سینہ صاف

از کرامتہائے خود شیخا ملاف

ترجمہ :- دعویٰ ہے کہ میں صوفی ہوں اور سینہ صاف نہیں۔ شیخ محترم مہربانی فرمایئے۔ اپنی کرامتوں کے دعوے مت بگھاریئے۔

می کنی طاعت تو از بہرِ ریا

گر نکردی سجدہ از بہر خدا

ترجمہ :- تمہاری ساری عبادت ریا اور نمود کے لئے ہے۔ اگر خدا کے لئے سجدہ کی توفیق نہیں ہوئی۔

نفس کافر کیش داری در کمیں

بہر شہرت مے نشینی اے لعیں

ترجمہ :۔ دل کے کمیں گاہ میں وہ نفس ہے جو کافرانہ انداز رکھتا ہے ۔ اے لعین و مردود تیری گوشہ نشینی بھی اسی غرض سے ہے کہ تارک دنیا مشہور رہو ۔

مے کشائی دست از بہرِ دعا

مزہ خواہی از عبادات ریا

ترجمہ :۔ دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہو اور واقعہ یہ ہے کہ اس نمائشی عبادت کی اجرت بندوں سے وصول کرنا چاہتے ہو ۔

مے کنی از سکر عالم را مطیع

مے دہی تسکیں منم فردا شفیع

ترجمہ :۔ مکروفریب سے دنیا کو مطیع کرنا چاہتے ہو اور لوگوں کو اطمینان دلاتے ہو کہ فردا ر قیامت کو میں سفارش کروں گا ۔

از تکبر می کنی ہر سو نظر

خویش را گوئی کہ ہستم باخبر

ترجمہ :۔ ہر طرف تکبر سے نظر ڈالتے ہو اور اپنے متعلق دعویٰ کرتے ہو کہ میں باخبر ہوں ۔

بُت پرستی مے کنی ہم بُت گری

شد دلت رشک بتانِ آزری

ترجمہ :۔ تم بت پرست بھی ہو اور بت گر بھی، تیرا دل بتانِ آزری کے لئے بھی باعثِ رشک ہے

آرزوہائے تو ہرگز کم نشد

قامت حرص و ہوایت خم نشد

ترجمہ :۔ تیری آرزوئیں کبھی بھی کم نہیں ہوتیں ۔ حرص و طمع کا قامت کبھی بھی خم نہیں ہوا ۔

تعجب ہوتا ہے آج ہر ایک نفس پرست اپنی نمائشی بدمستی اور آوارہ گردی کے لئے حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پناہ تلاش کرتا ہے۔ اس کا پروپیگنڈہ یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت بو علی شاہ قلندر بھی اسی کی طرح تھے اور یہ ٹھیک ٹھیک انھیں کے مانند اور انھیں کے نمونہ پر ہے۔ اور اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے مگر یہ اشعار جو اوپر ذکر کئے گئے اور اس مضمون کے بہت سے اشعار جن سے مثنوی کے صفحات رنگین ہیں۔ ان کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ کہ حضرت قلندر اس مسخ شدہ قلندری سے بیزار ہیں۔ یہ بیزاری یہاں تک بڑھتی ہے کہ تہذیب کا دامن بھی دست قلندر سے چھوٹ جاتا ہے۔

غور فرمایئے قلندر صاحب کس قدر برافروختہ ہیں۔ فرماتے ہیں :-

نفس کافر تو بود ہمراہ تو

آتشِ دوزخ بود جانکاہ تو

ترجمہ :- تیرا کافر نفس تیرے ہمراہ رہے تو آتشِ دوزخ تیرے لئے جانکاہ ہوگی۔

گر تو مردی نفسِ کافر را بکش

ور نداری دسترش بنشیں خمش

ترجمہ :- اگر واقعی مرد ہے تو نفس کافر کو ختم کر۔ اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو خاموش بیٹھو (شمع طریقت اور روحانی بزرگ ہونے کا دعویٰ مت کرو)

گر نداری ہمت مردانِ دین

چو زناں رو، در پس پردہ نشیں

ترجمہ :- اگر تمہارے اندر مردانِ دین جیسی ہمت نہیں ہے تو جاؤ اور عورتوں کی طرح پردہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔

گر زدست تو نیاید کار مرد

ہمچو ہیزاں درپس مرداں مگرد

ترجمہ :۔ اگر تمھارے ہاتھ سے مردوں کے کام نہیں ہوسکتے تو ہیز اور زنخوں کی طرح مَردوں کے پیچھے نہ گھومو۔

اے مخنث نے تو مردی نے تو زن

مثل شیطان راہ مرداں را مزن

ترجمہ :۔ او مخنث نہ تو مرد ہے نہ عورت، تو اب شیطان کی طرح لوگوں کی راہ مت مار (ان کو گمراہ مت کر)

ان اشعار میں بھی اعتدال ہے۔ اب اور ملاحظہ فرمائیے :۔

چوں نداری شرم اے پیماں شکن

باز می خواہی مراد خویشتن

ترجمہ :۔ او پیماں شکن بدعہد جب تیرے اندر شرم نہیں ہے تو پھر اپنی مراد پوری ہونے کی تمنا کبھی نہ رکھو۔

عمر با خامی طمع سر می زنی

بلکہ از ابلیس ملعوں کمتری

ترجمہ :۔ تمنا رخام ۔ میں اپنی عمر صرف کر رہے ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تم ابلیسِ لعین سے بھی کمتر ہو۔

نفس بد کردار چوں تو سگ پلید

دست ایمانت بدنداں لبس گزید

ترجمہ :۔ تجھ جیسے ناپاک کتے کا نفس بدکردار (معاذ اللہ) تیرے ایمان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

شہوت وخواب خورش داری مدام

از عبادت کاہلی و ناتمام

ترجمہ :۔ ہمیشہ ہمیشہ شہوت اور خواب وخور میں مصروف رہتے ہو اور جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو سراسر کاہلی اور سستی ۔ اور جو کچھ عبادت ہوتی ہے وہ ناقص اور ناتمام ۔

جہل خرداری تو اے بیہودہ گرد
انچہ تو کردی گہے شیطاں نہ کرد

ترجمہ :۔ گدھوں جیسی جہالت کا تو مالک ہے ۔ ایسے آوارہ گرد جو کچھ تو کر رہا ہے کبھی شیطان نے کبھی ایسا نہیں کیا ۔

یافت تعلیم از تو شیطاں مکر و ریو
از تو آموزند بازی طفل و دیو

ترجمہ :۔ تجھ سے شیطان نے مکر و ریا کی تعلیم پائی ہے ۔ شریر لڑکے اور دیو تجھ سے تعلیم پاتے ہیں

بہر لقمہ اے سگِ مردار خو
مے دوی صحرا بصحرا کو بکو

ترجمہ :۔ اے مردار طبیعت کتے تو لقمہ کے لئے دوڑتا ہے ۔ صحرا بصحرا کوچہ بکوچہ ۔

خوار می گردی زبہر آب و نان
در پئے سگ تا بکے باشی دوان

ترجمہ :۔ تو روٹی اور پانی کے لئے ذلیل پھرتا ہے ۔ آخر کب تک دنیا کے کتوں کے پیچھے دوڑتا رہیگا ۔

دین وایمان کے حق میں اندرونی خطرات

حفاظت کی صورتیں اور لائحہ عمل

چودھویں صدی ہجری کے لیل و نہار اس حالت میں گذر رہے ہیں کہ مسلمان

سخت ابتلاء آزمائش میں ہیں۔ اور اسلام بدخواہوں اور مخالفین کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن حضرت قلندر صاحبؒ اور ان کے معاصرین کا دور جس کے کچھ اجمالی حالات پچھلے صفحات میں لکھے گئے ہیں۔ دین و ایمان کے لحاظ سے وہ بھی اسی طرح خطرات کے نرغہ میں تھا۔ اہل ایمان اس وقت بھی ابتلاء و آزمائش میں تھے۔

چھٹی صدی ہجری کے تقریباً وسط میں فتنۂ تاتار برپا ہوچکا تھا۔ جس میں دارالخلافہ بغداد تباہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶ لاکھ مسلمان تہ تیغ کئے گئے اور جہاں تک اسلامی تہذیب سے عداوت کا تعلق ہے تو مساجد اور مدارس سے گذر کر لائبریریوں اور کتب خانوں تک کو برباد کیا گیا علوم و فنون کی کتابیں دریائے دجلہ میں بہادی گئیں۔ یہاں تک کہ عرصہ تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہوتا رہا۔

بے شک، یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے دشمنوں کو دوست بنا لیا اور جو اسلام کو مٹانے آئے تھے وہ خود اسلام کے لئے مٹنے لگے۔ مگر جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی یعنی وہی ملوکیت جو مٹنے والوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اس کا سرطان ان نو مسلم فرمانرواؤں کے رگ و ریشہ کو بھی اسی طرح مسموم بنائے ہوئے تھا۔ تاج و تخت کے لئے برادر کشی، نسل کشی اور قتل و خون کی گرم بازاری اب بھی اسی طرح قائم رہی اور یہ اژدہا اب بھی اسی طرح خاندان شاہ کے جگر پاروں کو ڈستا رہا۔ وہ اولوالعزم صاحب حوصلہ علماء اور مشائخ جنھوں نے اپنے اخلاقی اور روحانی کمالات سے سرکش کافروں کو یہاں تک مسخر کیا تھا کہ وہ فاتح اسلام ہونے کے بجائے مفتوح اسلام بن گئے تھے۔ انھوں نے سیاست

کی اس دہکتی ہوئی بھٹی کے قریب جانا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس دور میں سیاست اور ملوکیت کچھ اس طرح جکڑ بند تھیں کہ ممکن نہیں تھا کہ سیاست کے بحرِ محیط میں غرق ہونے کے بعد کسی شخص کا دامن ملوکیت کی آلائش سے پاک رہ سکے۔ ان حامیانِ ملت اور ہمدردانِ دین کے لئے سب سے زیادہ قلق اور صدمہ کی بات یہ تھی کہ ملوکیت کے یہ وحشیانہ مظاہرے جو بسا اوقات اسلام کے نام پر ورنہ کم از کم ان کی طرف سے ہوتے تھے جن کی زبان پر حمایت اسلام کے دعوے اور جن کے خطابات میں اس مفہوم کے الفاظ شامل ہوتے تھے وہ کسی غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل تو کیا کرتے اسلام سے متنفر بناتے رہتے تھے۔ اسلام مذہب رحمت ہے وہ جبر و اکراہ برداشت نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں زبانی اقرار کی کوئی اہمیت نہیں، جب تک ضمیر کی آواز اس کی تائید نہ کرے اور تسلیم و رضا اسکی پشت پر نہ ہو۔

وہ صرف یہی اعلان نہیں کرتا کہ دین اور دھرم کے بارے میں کسی زور زبردستی اور جبر و اکراہ کی قطعاً گنجائش نہیں (لا اکراہ فی الدین) بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ دھرم اور دین کے بارے میں جبر و اکراہ کو کام میں لائیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ یہ فتنہ ختم ہو۔ اور لوگوں کے دلوں کو یہ آزادی نصیب ہو کہ وہ دین کو کسی غلبہ تسلط یا کسی اقتدار کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ خالص اللہ کے لئے اختیار کر سکیں۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہٗ للہ۔

(سورۃ انفال)

(ترجمہ:۔ ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے پورا دین اللہ کیلئے)

پس اس دور میں اگرچہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کو حاصل رہا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام اب بھی نرغہ ہی میں تھا

اور مومنین با اخلاص کے لئے یہ دور بھی ابتلار و آزمائش کا دور تھا۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ آج یعنی چودھویں صدی ہجری میں ابتلا ر آزمائش کے بیشتر اسباب خارجی ہیں اور اس دور میں یہ ابتلا ر و آزمائش زیادہ تر ان کی وجہ سے تھا جو خود بھی حامیانِ اسلام اور ظل اللہ کہلاتے تھے۔

نشانِ راہ

قرآن حکیم میں رب العالمین نے بڑی پختگی سے فرمایا ہے:۔

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

(جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدے کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے رہتے ہیں)

چنانچہ مجاہدۂ حق کے ولولہ صادق نے علمار ربانی اور مشائخ حق پرست کی رہنمائی کی۔ اور انھوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی کشتی ڈوبنے کے بجائے ساحلِ مراد تک پہونچتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی۔

تبلیغ واشاعت کا لائحہ عمل

مسلک عشق ومحبت کا پرچار استقامت کے ساتھ رواداری

اسلام، اپنی انسانیت نوازی اور رحم پروری کے باعث اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ اس کو عشق ومحبت کا مذہب قرار دیا جا سکے۔ ان مجاہدین فی سبیل اللہ اور کشتگان خنجر تسلیم نے اس گنجائش سے فائدہ اٹھایا اور عشق ومحبت کو اپنا مذہب بنا دیا۔

ان کے فکر وعمل کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول یہ آیت کریمہ۔

الذین آمنوا اشد حبا للہ

اہل ایمان اللہ کی محبت (عشق مولیٰ) میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں

دوم - یہ حدیث مقدس:-

الخلق عیال اللہ

(مخلوقِ خدا اللہ کا کنبہ ہے)

لائحہ عمل اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی رضا جوئی اور اطاعت و فرماں برداری کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کو اس نے "صراط مستقیم" قرار دیا ہے۔ اور جس کو تمام محبان خدا کا راستہ بتایا ہے۔ لیکن یہ صراط مستقیم تنگ و تاریک نہیں ہے۔ وہ کھلے ہوئے میدانوں سے گذرتا ہے۔ اس کی فضا پُر کیف اور خوشگوار ہے۔ وہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔" کی لائنوں پر ہموار کیا گیا ہے۔ اس کے بانی نے اعلان کر دیا ہے۔

لکل وجھۃ ھو مولیھا (سورہ بقرہ)

(ہر ایک کے لئے ایک طرف (ایک رخ) ہے کہ وہ منھ کرتا ہے اس طرف' تمھارا کام یہ ہے کہ نیک کاموں میں سبقت کرو۔ اور آگے بڑھو)

لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا۔ (سورہ مائدہ)

(ہر ایک کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ ہم نے ایک دستور اور مقرر کر دی ہے ایک راہ)

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ (سورہ حج)

(ہر ایک فرقہ کی ٹھہرا دی ہم نے ایک راہ بندگی کی۔ کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی)

بہر حال یہ تین بنیادیں تھیں۔ جن پر ان بندگان حق پرست کے فکر و عمل کی تعمیر ہوئی تھی یعنی (۱) اللہ سے محبت۔ اور عشق مولیٰ (۲) بندگان خدا سے محبت اور خلق خدا کی ہمدردی (۳) روا داری اور دوسری ملتوں کے لئے فراخی حوصلہ۔

اس کی مثال حضرت سلطان الاولیاء محبوب ربانی نظام الدین (بدایونی ثم الدہلوی) کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے ایک برہمن کو دیکھا کہ وہ بھی اس کی پوجا

کر رہا ہے۔ جس کی محبت میں سلطان الاولیاء کا دل پرسوز ہے۔ تو غیض و غضب یا اشتعال کے بجائے آپ کی زبان مبارک پر برجستہ یہ مصرع موزوں ہو گیا۔

ہر قوم راست راہے
دینے و قبلہ گاہے

(ہر قوم کے لئے ایک راہ ہے، ایک دین ہے اور ایک قبلہ گاہ ہے)

قرآن حکیم کی آیت ولکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا۔ کی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

بیشک عشق و محبت اور رواداری کے نام پر غلطیاں بھی ہوئیں۔ کسی نے عشق و محبت کے بہانے بے قیدی اور آوارگی کو قلندری قرار دے لیا۔ کسی نے رقص و سرود کا نام چشتیت رکھ لیا۔ کبھی رواداری کو مداہنت کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ عشق و محبت کے دائرہ کو (معاذ اللہ) نفس پرستی کی سرحد سے ملا دیا گیا۔ مگر جس حقیقت کا انکار ممکن نہیں ہے وہ یہ ہے کہ وہ پیغام جو حضرت خاتم المرسلین، محبوب رب العالمین، رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کا مقصد تھا۔ اس دور میں انھیں محبت کے متوالوں کے ذریعہ بندگانِ خدا تک پہونچا۔ اور وہ یقیناً ان لاکھوں مجروح دلوں کے لئے مرہم شفا بنا جو ملوکانہ اقتدار کی جبروتیت و قہاریت سے مجروح تھے۔

۱۹۴۷ء کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ لاکھوں مسلمان جو تقسیم ہند اور تبادلہ آبادی کے قیامت خیز ہنگاموں کا تختۂ مشق بنے تھے وہ گاندھی جی کے فدائی اور جاں نثار بن گئے۔ کیونکہ گاندھی جی نے اپنی ہمدردیوں اور میٹھے بول سے ان کے زخمی دلوں پر اطمینان کا مرہم رکھا تھا۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ فریدالدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ) شمس تبریز (م ۶۴۵ھ)

مولانا روم (م ۶۷۲ھ) امیر خسرو (م ۷۲۵ھ) خواجہ اجمیری (م ۶۳۳ھ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۶۱ھ) فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۴ھ) مولانا حمید الدین صوفی (م ۶۷۳ھ) حسام الدین بدایونی (م ۶۸۷ھ) علاؤ الدین صابر کلیری (م ۶۹۰ھ) نظام الملۃ والدین بدایونی ثم الدہلوی (م ۷۲۵ھ) جیسے بزرگ جتنے بھی ہیں۔ وہ مے کدہ عشق ومحبت کے ساقی بنے ہوئے ہیں۔ تو یقین جانئے "یہ بے خودی بے سبب نہیں غالب" یعنی محض جذبات اور بے مغز ہاؤ ہو نہیں ہے۔ بلکہ ایک مقصد ہے اور ایک پروگرام ہے جس پر نہایت پختگی اور ہوشمندی سے عمل ہو رہا ہے۔" دیوانہ بکار خویشتن ہوشیار۔"

حضرت قلندر صاحب اور مسلکِ عشق

یہ تو حدیث دیگراں تھیں۔ اب خود قلندر صاحب کی سنیئے کہ کس طرح عشق کو جوہر حیات اور دین و دنیا کی متاعِ بے بہا قرار دیتے ہیں۔ اور کس طرح ان کی تمنا ہے کہ سوزِ عشق دم بدم بڑھتا رہے اور پروانہ کی طرح تن من نذر سوز ہوتا رہے۔

ارشاد ہے:۔

ہر دمے کز عشق جانے یافتہ	جس دل نے عشق سے زندگی حاصل کرلی۔
تا ابد روح روانے یافتہ	اُس نے ابد تک روح رواں حاصل کرلی۔
بر دل ہر کس کہ نورِ عشق تافت	جس شخص کے دل پر عشق کا نور درخشاں ہوتا ہے
خویش را با جانِ جاناں زندہ یافت	وہ اپنے آپکو جان جاناں (معشوق حقیقی) کیساتھ زندہ پاتا ہے۔
دل کہ بر دلبر رسد از سازِ عشق	دل تو وہی ہے جو عشق کی ساز سے دلبر تک پہنچ جائے
جان کہ بر جاناں دہد آوازِ عشق	جان وہی ہے جو جاناں کو عشق کا پیغام دے

دلربا بر دلبرے عشقت دہد
دل رُبا (معشوق) تمہارے اندر دلبر کا عشق پیدا کرتا ہے

عشق کو تا جامۂ ہستی دردہد
وہ عشق جو جامۂ ہستی کو چاک کر ڈالتا ہے۔

عشق کو بے بال و پر طیراں کند
عشق ۔ وہ عشق جو بال و پر کے بغیر پرواز کرتا ہے۔

عشق کو در لامکاں جولاں کند
وہ عشق جو لامکان میں جولانی کرتا ہے۔

عشق کو تا تاج سلطانی نہد
ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ تمہیں بادشاہت کا تاج میسر آجائے

عشق کو ملک سلیمانی نہد
ہاں وہ عشق جو حضرت سلیمانؑ کی وسیع ترین مملکت بخش دیتا ہے

عشق کو تا چشمِ دل بینا کند
وہ عشق درکار ہے جو دل کی آنکھ کو بینا بنا دے۔

عشق کو تا سینہ پُر سودا کند
ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ سینہ سودا سے لبریز ہو جائے

عشق کو تا عقل را زائل کند
ہاں وہ عشق چاہیئے جسکے آتے ہی عقل زائل ہو جاتی ہے

عشق کو تا عقل را حاصل کند
ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ عقل اور سمجھ میسر آجائے۔

عشق ایک لازوال دولت ہے۔ کیونکہ وہ حُسن لازوال کا پرتو ہے جب تک اصل باقی ہے یہ پرتو بھی باقی ہے۔

ہیچ می دانی کہ اصل عشق چیست
تمہیں کچھ خبر ہے۔ عشق کی اصل بنیاد کیا ہے

عشق را از حُسن جاناں زندگی ست
عشق کی اصل بنیاد حسنِ جانان ہے اسی سے اسکی زندگی ہے

حُسنِ جاناں چو نظر در خویش کرد
حُسن جانان نے جب خود اپنے اوپر نظر کی۔

گشت شیدا عشق را در پیش کرد
تو وہ خود شیدا اور مفتون ہو گیا۔ اور عشق کا عنوان سامنے کر دیا۔

کشتگانِ عشق را جانِ دگر
پس جبکہ عشق خود حسن اور حسن خود عشق ہے تو جو عشق کے شہید ہیں انہیں ایک دوسری...

ہر زماں از غیب احسانِ دگر
ہر زماں اور ایک نئی خوبی ہر وقت میسر آتی رہتی ہے۔

لہٰذا فراست و بصیرت کی بات یہ ہے کہ:۔

ار توانی اے دلا در عشق کوش
اے دل ۔ اگر طاقت اور امکان ہے تو عشق کیلئے کوشش کرتا رہ

ایں حکایت را زعاشق دار گوش
اور عاشق کی طرف یہ بات کان میں ڈالے رکھو۔ کہ

(یاد رہے اصحاب عشق اپنی عقل ہی کو عقل سمجھتے ہیں اور ارباب ظاہر کی عقل کو نادانی قرار دیتے ہیں)

اے خنک جانے کہ خود را باختہ
وہ جان کس قدر اچھی اور مبارک ہے جس نے خود اپنی بازی لگا دی

سوختہ خود را و با حق ساختہ
اپنے آپ کو مبتلا سوز کیا اور حق کے ساتھ ساز کر لیا۔

ہمت پروانہ بیں اے بے خبر
پروانہ کے حوصلہ کو دیکھ۔ اے نادان

سوز چوں پروانہ تا یابی خبر
بس تم بھی پروانہ کی طرح بھسم ہو جاؤ تب تم کو محبوب کا پتہ لگیگا

در محبت تا نسوزی بال و پر
جب تک محبت میں اپنے بال پر نہ جلا ڈالو گے۔

کے شوی ہمرنگ آتش سر بسر
سر سے پاؤں تک آگ کے ہمرنگ کس طرح ہو سکتے ہو۔

مثنوی کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی قسم کے اشعار سے رنگین ہے۔ اس کے علاوہ اسی مضمون کی بہت سی غزلیں آپ کے دیوان میں ہیں۔ جو حضرت قلندر صاحب کے مسلکِ عشق کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ مسلکِ عشق کا عکس خلقِ خدا پر لطف و رحم اور ہمدردی و غمخواری کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ یہی قلندری کا جوہر ہوتا تھا۔ اور تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں یہ حضرات اسی جوہر سے کام لیتے تھے۔

ایک سوال — اور — جواب

مسلک عشق کی دعوت دیتے ہوئے قلندر صاحب نے عشق کی جو خوبیاں بیان کی ہیں۔ اُن کا نچوڑ یہ دو شعر ہیں۔

ہمت پروانہ بیں اے بے خبر
سوز چوں پروانہ تا یابی خبر
در محبت تا نسوزی بال و پر
کے شوی ہم رنگ آتش سر بسر

ترجمہ:- اے بے خبر پروانہ کی ہمت دیکھ، اگر تم باخبر ہونا چاہتے ہو تو پروانہ کی طرح جل جاؤ۔ محبت میں جب تک اپنے بال اور پر نہیں جلا لو گے۔ تو